باقاعدہ تصدیق شدہ اشاعت وزارت اطلاعات ونشریات حکومت پاکستان

ABC CERTIFIED

روزنامہ **آئینہ** کوئٹہ

Daily AAINA Quetta

قیمت 5 روپے

بانی: منصور الہدیٰ عباسی

ریذیڈنٹ ایڈیٹر: فہیم الزمان ملاخیل

چیف ایڈیٹر عامر امیر اعوان

ایڈیٹر فیصل کریم

03332831889 ✵ Daily.aaina94@gmail.com

جلد نمبر 30 | بروز جمعرات 06 اگست 2026ء 1447 ھجری | قیمت 05 روپے | شمارہ نمبر 208

بھارتی اقدامات بدستور گہری تشویش کا باعث ہیں، اسحاق ڈار

بھارت کے غیر قانونی زیر تسلط جموں وکشمیر کے عوام اپنے جائز حق خودارادیت کے حصول کی جدوجہد میں مسلسل سنگین چیلنجز کا سامنا کر رہے ہیں

جنوبی ایشیا میں پائیدار امن اور استحکام صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب جموں وکشمیر کے تنازع کو کشمیری عوام کی امنگوں اور اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی متعلقہ قراردادوں کے مطابق حل کیا جائیگا

اسلام آباد (اے این این) نائب وزیر اعظم اور وزیر خارجہ سینیٹر محمد اسحاق ڈار نے کہا ہے کہ بھارت نے 5 اگست 2019 کو اپنے غیر قانونی زیر تسلط جموں وکشمیر میں یکطرفہ اور غیر قانونی اقدامات کا ایک سلسلہ اختیار کیا، ان اقدامات کا مقصد اس خطے کی بین الاقوامی سطح پر تسلیم شدہ متنازع حیثیت کو تبدیل کرنا اور کشمیری عوام کے حقوق اور امنگوں کو مجروح کرنا تھا، 5 اگست 2019 کے اقدامات اور ان کے بعد کیے جانے

بقیہ 1 صفحہ 3 پر

خطے میں امن کا قیام تنازع جموں وکشمیر کے پر امن حل سے جڑا ہے، آصف زرداری

کشمیریوں کی بہادری، اور حق خودارادیت کیلئے ان کی منصفانہ جدوجہد کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں، آج بھارت کے غیر قانونی اور یکطرفہ اقدامات کو 7 برس مکمل ہو چکے ہیں

مقبوضہ جموں وکشمیر کے عوام مستقبل کے فیصلے، جائز حق کیلئے ثابت قدم ہیں، پاکستان مقبوضہ جموں کشمیر کے عوام کی اخلاقی، سیاسی اور سفارتی حمایت جاری رکھے گا۔

اسلام آباد (جی این ایم) صدر مملکت آصف علی زرداری نے کہا ہے کہ جنوبی ایشیا میں پائیدار اور منصفانہ امن کا قیام تنازع جموں وکشمیر کے پر امن حل سے جڑا ہے، مقبوضہ جموں وکشمیر کے عوام کے ساتھ غیر متزلزل یکجہتی کا اعادہ کرتے ہیں۔ یوم استحصال کشمیر پر صدر زرداری نے پیغام جاری کرتے ہوئے صدر مملکت نے کہا کہ کشمیریوں کی بہادری، اور حق خود ارادیت کیلئے ان کی منصفانہ

بقیہ 2 صفحہ 3 پر

اسلام آباد: جائیکا کے صدر کی وزیر اعظم ہاؤس آمد، شہباز شریف خیر مقدم کر رہے ہیں

5 اگست کا بھارتی اقدام غیر قانونی تھا، وزیر اعلیٰ بلوچستان

5 اگست 2019 کو بھارت کی جانب سے آرٹیکل 370 اور 35 اے کی منسوخی ایک غیر قانونی، یکطرفہ اور بین الاقوامی قوانین کے منافی اقدام تھا، وزیر اعلیٰ بلوچستان میر سرفراز بگٹی

بلوچستان کشمیری عوام کے ساتھ ہر مشکل گھڑی میں کھڑے ہیں اور ان کے جائز حقوق کے حصول تک اپنی بھرپور اخلاقی اور سفارتی حمایت جاری رکھیں گے۔

کوئٹہ (خ ن) وزیر اعلیٰ بلوچستان میر سرفراز بگٹی نے یوم استحصال کشمیر کے موقع پر اپنے خصوصی پیغام میں کہا ہے کہ وہ اپنی جانب سے اور اہل بلوچستان کی طرف سے مقبوضہ جموں وکشمیر کے عوام کے ساتھ بھرپور یکجہتی کا اظہار کرتے ہیں۔ انہوں

بقیہ 3 صفحہ 3 پر

اسحٰق ڈار کی اردن کے نائب وزیر اعظم سے ملاقات

دوطرفہ تعلقات میں بڑھتی ہوئی پیش رفت کا خیر مقدم

عمان (این این آئی) نائب وزیر اعظم و وزیر خارجہ سینیٹر محمد اسحاق ڈار نے عمان میں مقبوضہ بیت المقدس سے متعلق وزارتی اجلاس کے موقع پر اردن کے نائب وزیر اعظم اور وزیر خارجہ ایمن الصفادی سے ملاقات کی۔ بدھ کو دفتر خارجہ کے مطابق ملاقات کے دوران دونوں رہنماؤں نے پاکستان اور اردن کے درمیان دوطرفہ تعلقات میں

بقیہ 4 صفحہ 3 پر

بھارت کے 5 اگست کے اقدامات عالمی قوانین کی صریح خلاف ورزی ہیں، عطا تارڑ

کشمیریوں کا حق خودارادیت ہر قیمت پر تسلیم ہونا چاہیے، مسئلہ جموں وکشمیر کا واحد پائیدار حل اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی قراردادوں اور کشمیری عوام کی امنگوں کے مطابق استصواب رائے ہے

پاکستان کی سیاسی وعسکری قیادت کشمیر کے معاملے پر یکساں موقف رکھتی ہے، بھارت کو حقائق تسلیم کرتے ہوئے کشمیری عوام کی خواہشات کا احترام کرنا ہوگا

اسلام آباد (جی این ایم) وفاقی وزیر اطلاعات ونشریات عطا اللہ تارڑ نے یوم استحصال کشمیر کے موقع پر کشمیری عوام کے حق خودارادیت کی حمایت کا اعادہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ بھارت کے غیر قانونی اقدامات اقوام متحدہ کی قراردادوں اور عالمی قوانین کی صریح خلاف ورزی ہیں۔ یوم استحصال پر اپنے پیغام میں عطا تارڑ نے کہا کہ 5 اگست بھارت کے غیر قانونی اقدامات کی سیاہ یاد

بقیہ 5 صفحہ 3 پر

احد چیمہ کی جائیکا کو مین لائن ون (ML-1) ریلوے منصوبے میں شریک مالی معاونت پر غور کرنے کی دعوت

ایشیائی ترقیاتی بینک اور دیگر ترقیاتی شراکت دار اس اہم منصوبے کی حمایت کر رہے ہیں، وفاقی وزیر کی جائیکا کے صدر سے گفتگو

اسلام آباد (این این آئی) وفاقی وزیر برائے اقتصادی امور احد چیمہ نے جاپان انٹرنیشنل کوآپریشن ایجنسی (جائیکا) کو مین لائن ون (ML-1) ریلوے منصوبے میں شریک مالی معاونت پر غور کرنے کی دعوت دیتے ہوئے کہا کہ ایشیائی ترقیاتی بینک اور دیگر ترقیاتی شراکت دار اس اہم منصوبے کی حمایت کر رہے ہیں۔ انہوں نے یہ بات انہوں نے جائیکا کے صدر ڈاکٹر تاناکا آکیہکو کی قیادت میں ملاقات کرنے والے اعلیٰ سطحی وفد سے گفتگو کی کی۔ ملاقات میں پاکستان اور جاپان کے درمیان ترقیاتی تعاون کو مزید فروغ

بقیہ 6 صفحہ 3 پر

اسلام آباد، وزیر اعظم شہباز شریف سے ایران کے وزیر صنعت، کان اور تجارت ایچ ای سید محمد اتابک ملاقات کر رہے ہیں

پاکستان ہر سفارتی، سیاسی اور بین الاقوامی فورم پر کشمیری عوام کی آواز بلند کرتا رہے گا، وجیہہ قمر

پاکستان ہر سفارتی، سیاسی اور بین الاقوامی فورم پر کشمیری عوام کی آواز بلند کرتا رہے گا، وزیر مملکت برائے تعلیم

اسلام آباد (این این آئی) وزیر مملکت برائے وفاقی تعلیم و پیشہ ورانہ تربیت وجیہہ قمر نے کشمیری عوام کے حق خودارادیت کی غیر متزلزل حمایت کا اعادہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ 5 اگست 2019 کا بھارت کا یکطرفہ اور غیر قانونی اقدام بین الاقوامی قوانین، اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی قراردادوں اور کشمیری عوام کے بنیادی حق

بقیہ 8 صفحہ 3 پر

کراچی کی بندرگاہوں کیلئے ٹرانس شپمنٹ مراعاتی پیکیج کا اعلان

کراچی (این این آئی) وفاقی وزیر بحری امور جنید انوار چوہدری نے کراچی کی بندرگاہوں کے لیے ٹرانس شپمنٹ مراعاتی پیکیج کا اعلان کر دیا۔ وفاقی وزیر بحری امور کے مطابق ٹرانس

بقیہ 7 صفحہ 3 پر

سندھ حکومت کی وفاقی حکومت کے گندم درآمد کرنے کے فیصلے کی مخالفت

پنجاب حکومت بین الصوبائی گندم کی نقل وحرکت محدود کر رہی، پنجاب میں 7 ملین میٹرک ٹن گندم سرپلس ہے، وزیر خوراک سندھ

کراچی (این این آئی) سندھ حکومت نے وفاقی حکومت کے گندم درآمد کرنے کے فیصلے کی مخالفت کر دی۔ نجی ٹی وی سے گفتگو کرتے ہوئے وزیر خوراک سندھ مخدوم محبوب الزمان نے کہا ہے کہ درآمدی گندم سے مقامی کاشت کاروں کو نقصان پہنچے گا۔ انہوں نے کہا ہے کہ پنجاب حکومت بین الصوبائی گندم کی نقل وحرکت محدود کر رہی ہے، پنجاب میں 7 ملین میٹرک ٹن گندم سرپلس جبکہ سندھ میں تقریباً 1 ملین میٹرک ٹن کی کمی ہے۔ وزیر

بقیہ 11 صفحہ 3 پر

پاکستان میں الیکٹرک گاڑیوں کا فروغ، رواں سال کی پہلی ششماہی میں درآمدات میں 10 گنا سے زائد کا اضافہ

2026 کی پہلی ششماہی کے دوران چین سے درآمد کی جانے والی پلگ ان ہائبرڈ اور الیکٹرک گاڑیوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ریکارڈ

بیجنگ (این این آئی) پاکستان میں الیکٹرک گاڑیوں کے استعمال کا رجحان تیزی سے فروغ پا رہا ہے، جہاں چینی ٹیکنالوجی کے تعاون سے ملک کا آٹوموبائل شعبہ نئی توانائی کی جانب بڑھ رہا ہے۔ کسٹمز کے اعداد وشمار کے مطابق 2026 کی پہلی ششماہی کے دوران چین سے درآمد کی جانے والی پلگ ان ہائبرڈ اور الیکٹرک گاڑیوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ریکارڈ کیا گیا ہے۔ چائنا اکنامک نیٹ کے مطابق چین کی جنرل ایڈمنسٹریشن آف

بقیہ 9 صفحہ 3 پر

یوم استحصال پر مسلح افواج کا مقبوضہ کشمیر کے عوام سے اظہار یکجہتی

اسلام آباد (این این آئی) فیلڈ مارشل عاصم منیر، پاک فضائیہ کے سربراہ ایئر چیف مارشل ظہیر احمد بابر سدھو اور پاک بحریہ کے سربراہ ایڈمرل نوید اشرف نے یوم استحصال پر مقبوضہ کشمیر کے عوام سے

بقیہ 10 صفحہ 3 پر

5 اگست 2019 ہمیشہ ایک سیاہ دن کے طور پر یاد رکھا جائے گا، حافظ نعیم

بھارت نے سلامتی کونسل کی متعلقہ قراردادوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مقبوضہ جموں وکشمیر کی خصوصی حیثیت ختم کی، پیغام

لاہور (این این آئی) امیر جماعت اسلامی حافظ نعیم الرحمن نے کہا ہے کہ 5 اگست 2019 تحریک آزادی کشمیر کی تاریخ میں ہمیشہ ایک سیاہ دن کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔ امیر جماعت اسلامی پاکستان حافظ نعیم الرحمن نے یوم استحصال کشمیر کے موقع پر اپنے پیغام میں کہا ہے کہ بھارت نے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی متعلقہ قراردادوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مقبوضہ جموں وکشمیر کی خصوصی حیثیت ختم کی، جس سے مسئلہ کشمیر مزید پیچیدہ اور متنازعہ ہو گیا۔ انہوں نے کہا بھارت کے 5 اگست 2019 کے غیر قانونی اور یکطرفہ

بقیہ 12 صفحہ 3 پر

یوم استحصال کشمیر کی مناسبت سے آئی ایس پی آر کا خصوصی نغمہ جاری

مظفر آباد (این این آئی) 5 اگست یوم استحصال کشمیر کے موقع پر آئی ایس پی آر نے نیا نغمہ "آزادی" جاری کر دیا۔ واجد سعید کی سحر انگیز آواز میں یہ نغمہ کشمیری عوام کے جذبات اور امنگوں کی

بقیہ 14 صفحہ 3 پر

صدر نے سمری پر دستخط نہ کیے، پشاور ہائیکورٹ کے 4 جج مزید کام نہیں کر سکیں گے

صدر پہلے ججز کو چھ ماہ کی توسیع دینے کی سمری پر دستخط کر چکے، فوری طور پر ججز کی مستقلی کی سمری پر دستخط کریں، صدر ہائیکورٹ بار کا مطالبہ

اسلام آباد (این این آئی) صدر مملکت کی جانب سے سمری پر دستخط نہ ہونے کے باعث پشاور ہائیکورٹ کے چار ججز مزید جوڈیشل کام نہیں کر سکیں گے، جوڈیشل کمیشن نے 20 جولائی کو ہونے والے اجلاس میں پشاور ہائیکورٹ کے چار ججز کو مستقل کرنے کی منظوری دی تھی تاہم صدر آصف علی زرداری نے تاحال نوٹیفکیشن پر دستخط نہیں کیے، مستقل کیے جانے والے ججز میں جسٹس فرح جمشید، جسٹس انعام اللہ خان، جسٹس ثابت اللہ خان

بقیہ 15 صفحہ 3 پر

کوئٹہ، وزیر اعلیٰ بلوچستان میر سرفراز بگٹی سے سردار حق نواز خان بزدار کی قیادت میں موسیٰ خیل کے بزدار عمائدین کا وفد ملاقات کر رہا ہے

مریم نواز سے جائیکا کے صدر کی ملاقات، مختلف شعبوں میں تعاون بڑھانے پر اتفاق

تعلیم، صحت، غذائیت، خواتین کو بااختیار بنانے اور انسانی وسائل کی ترقی کے شعبوں میں تعاون مزید بڑھانے پر اتفاق

لاہور (این این آئی) وزیر اعلیٰ پنجاب مریم نواز شریف سے جاپان انٹرنیشنل کوآپریشن ایجنسی (جائیکا) کے صدر ڈاکٹر اکیہکو تاناکا نے وفد کے ہمراہ ملاقات کی جس میں پنجاب میں جاری ترقیاتی منصوبوں اور مستقبل میں باہمی تعاون کے فروغ پر تفصیلی تبادلہ خیال کیا گیا۔ وزیر اعلیٰ نے لاہور آمد پر جائیکا کے وفد کا خیر مقدم کیا، ملاقات میں عوامی فلاح وبہبود کے مختلف منصوبوں، ترجیحی شعبوں میں اشتراک کار اور پنجاب میں جاری جائیکا کے ترقیاتی

بقیہ 13 صفحہ 3 پر

کوئی طاقت کشمیری عوام کی شناخت اور حق خودارادیت ختم نہیں کر سکتی، مشعال ملک

اسلام آباد (این این آئی) مشعال ملک نے یوم استحصال کشمیر کے موقع پر کہا ہے کہ 5 اگست کشمیریوں کی تاریخ کا سیاہ ترین دن ہے، تاہم کوئی طاقت کشمیری عوام کی شناخت اور حق خودارادیت کو

بقیہ 17 صفحہ 3 پر

چمن اور لکی مروت میں دستی بم حملوں میں 3 افراد جاں بحق

لکی مروت کے علاقے بہرام خیل میں ایک گھر کے اندر دستی بم پھٹنے سے رشید، اس کی بھابھی اور کمسن بھتیجا جاں بحق، 3 بچے زخمی

چمن، لکی مروت (این این آئی) بلوچستان کے ضلع چمن اور خیبر پختونخوا کے ضلع لکی مروت میں الگ الگ دستی بم حملوں کے نتیجے میں مجموعی طور پر 4 افراد جاں بحق اور 7 افراد زخمی ہو گئے۔ پولیس کے مطابق لکی مروت کے علاقے بہرام خیل میں ایک گھر کے اندر دستی بم پھٹنے سے رشید نامی شخص، اس کی بھابھی اور کمسن بھتیجا جاں بحق اور 3 بچے زخمی ہوئے۔ زخمیوں کو طبی امداد کے لیے ہسپتال منتقل کر دیا گیا۔ پولیس کے مطابق واقعے کا مقدمہ تاحال درج نہیں کیا گیا اور مزید تحقیقات جاری ہیں۔ دوسری جانب بلوچستان کے ضلع چمن میں

بقیہ 16 صفحہ 3 پر

گورنر ہاؤس پشاور سے کشمیری عوام سے اظہار یکجہتی کیلئے ریلی

دنیا بھر کے مسلمان کشمیری عوام کی آزادی اور ان کے حق خودارادیت کی حمایت کے لیے متحد ہیں، فیصل کریم کنڈی

پشاور (این این آئی) یوم استحصال کشمیر کے موقع پر گورنر ہاؤس پشاور سے کشمیری عوام سے اظہار یکجہتی کے لیے ریلی نکالی گئی جس کی قیادت گورنر خیبر پختونخوا فیصل کریم کنڈی نے کی۔ ریلی میں عوام کی بڑی تعداد نے شرکت کی، جبکہ شرکاء نے کشمیری عوام سے اظہار یکجہتی کے لیے ایک منٹ کی خاموشی بھی اختیار کی۔ اس موقع پر خطاب کرتے

بقیہ 19 صفحہ 3 پر

پاکستان کشمیریوں کی شناخت پر حملہ کبھی تسلیم نہیں کرے گا، مریم نواز

لاہور (این این آئی) وزیر اعلیٰ پنجاب مریم نواز شریف نے یوم استحصال کشمیر کے موقع پر کشمیری عوام سے غیر متزلزل یکجہتی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ 5 اگست 2019 کا دن کشمیریوں

بقیہ 18 صفحہ 3 پر

کوئٹہ، صوبائی وزیر تعلیم راحیلہ درانی سے رکن صوبائی اسمبلی ملک نعیم خان بازئی اسمبلی اجلاس کے بعد بات چیت کر رہے ہیں

بھارتی ہتھکنڈے کشمیری عوام کی شناخت، ثقافت اور تاریخی تشخص کو ختم نہیں کر سکتے، سیدال خان

ظلم، جبر، محاصرے، جبری گمشدگیوں، ماورائے عدالت قتل، سیاسی کارکنوں کی گرفتاریوں اور اظہار رائے پر پابندیوں کے باوجود کشمیری عوام کے حوصلے پست نہیں ہوئے

بین الاقوامی قوانین اور انسانی حقوق کے مسلمہ اصولوں کی صریح خلاف ورزی ہیں، جنہیں پاکستان اور کشمیری عوام نے کبھی قبول نہیں کیا اور نہ ہی آئندہ کریں گے

کوئٹہ، اسلام آباد (جی این ایم) ڈپٹی چیئرمین سینیٹ سیدال خان ناصر نے کشمیری عوام کی حق خودارادیت کی جدوجہد کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ بھارت کے غیر قانونی اقدامات عالمی قوانین کی کھلی خلاف ورزی ہیں۔ یوم استحصال کشمیر کے موقع پر اپنے پیغام میں انہوں نے کہا کہ 5 اگست 2019 تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے، جب بھارت نے یکطرفہ اور غیر

بقیہ 21 صفحہ 3 پر

کشمیری عوام دہائیوں سے بھارتی دہشتگردی کا بہادری سے مقابلہ کر رہے ہیں، سلیم کھوسہ

5 اگست 2019 کو بھارت نے جو غیر آئینی اقدام اٹھایا وہ نہ صرف کشمیریوں کے بنیادی انسانی حقوق پر حملہ ہے بلکہ اقوام متحدہ کی قراردادوں کی بھی کھلی خلاف ورزی ہے

بھارت کا پانچ اگست کا اقدام مکمل طور پر غیر قانونی اور غیر اخلاقی ہے، جسے عالمی برادری کو مسترد کرنا چاہیے، کشمیری عوام کو ان کا حق خودارادیت دلوانے میں کردار ادا کریں

کوئٹہ (جی این ایم) صوبائی وزیری ایس اینڈ جی اے ڈی بلوچستان میر سلیم احمد خان کھوسہ نے پانچ اگست "یوم استحصال کشمیر" کے موقع پر اپنے بیان میں کشمیری عوام سے مکمل یکجہتی کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ 5 اگست 2019 کو بھارت نے جو غیر آئینی اقدام اٹھایا وہ نہ صرف کشمیریوں کے بنیادی انسانی حقوق پر حملہ ہے بلکہ اقوام متحدہ کی قراردادوں کی بھی کھلی خلاف ورزی

بقیہ 20 صفحہ 3 پر

طاقت کے ذریعے کسی قوم کی شناخت، تاریخ اور حق آزادی کو دبایا نہیں جا سکتا، محمد حنیف عباسی

پاکستان ہر بین الاقوامی فورم پر کشمیری عوام کی جائز آواز بن کر ان کے حق خودارادیت کی حمایت جاری رکھے گا، وفاقی وزیر

اسلام آباد (این این آئی) وفاقی وزیر برائے ریلوے محمد حنیف عباسی نے کہا ہے کہ طاقت کے ذریعے کسی قوم کی شناخت، تاریخ اور حق آزادی کو دبایا نہیں جا سکتا، جنوبی ایشیا میں دیرپا امن اور ترقی کا راستہ مسئلہ جموں وکشمیر کے منصفانہ اور پائیدار حل سے ہو کر گزرتا ہے، پاکستان ہر بین الاقوامی فورم پر کشمیری عوام کی جائز آواز بن کر ان کے حق خودارادیت کی حمایت جاری رکھے گا۔ یوم استحصال کشمیر کے موقع پر اپنے پیغام میں انہوں نے کہا کہ 5 اگست 2019 کے یکطرفہ بھارتی اقدامات نے خطے میں اعتماد، امن اور استحکام کو شدید نقصان پہنچایا، جموں وکشمیر کی متنازعہ حیثیت اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی قراردادوں سے طے

بقیہ 26 صفحہ 3 پر

5 اگست کو ہمیشہ یوم سیاہ کے طور پر یاد رکھا جائے گا، مولانا فضل الرحمٰن

اسلام آباد (این این آئی) جمعیت علمائے اسلام (ف) کے سربراہ مولانا فضل الرحمان نے کہا ہے کہ 5 اگست کو ہمیشہ یوم سیاہ کے طور پر یاد رکھا جائے گا، یوم استحصال کشمیر پر بھارت کا مکروہ

بقیہ 22 صفحہ 3 پر

پاکستان کشمیری عوام کو کبھی تنہا نہیں چھوڑے گا، ڈاکٹر مصدق ملک

پاکستان ہر سطح پر کشمیری عوام کی سفارتی، سیاسی اور اخلاقی حمایت جاری رکھے گا، وفاقی وزیر کا بیان

اسلام آباد (این این آئی) وفاقی وزیر برائے موسمیاتی تبدیلی و ماحولیاتی ہم آہنگی سینیٹر ڈاکٹر مصدق ملک نے کہا ہے کہ 5 اگست 2019 کو بھارت کی جانب سے جموں وکشمیر کی خصوصی آئینی حیثیت ختم کرنے کا اقدام غیر قانونی، یکطرفہ اور ناقابل قبول تھا جو اقوام متحدہ کی قراردادوں اور بین الاقوامی قوانین کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔ بدھ کو یوم استحصال کشمیر کے موقع پر اپنے پیغام میں انہوں نے کہا کہ کشمیری عوام کے حق خودارادیت کی حمایت پاکستان کی قومی پالیسی کا لازمی حصہ ہے اور پاکستان ہر سطح پر کشمیری عوام کی سفارتی، سیاسی اور اخلاقی حمایت جاری رکھے گا۔ انہوں نے اس عزم کا اعادہ کیا کہ پاکستان کشمیری

بقیہ 23 صفحہ 3 پر

وزیر خزانہ سے امریکی تجارتی نمائندے کی ورچوئل ملاقات

باہمی تجارتی و اقتصادی تعاون کو فروغ دینے پر اتفاق

اسلام آباد (این این آئی) وزیر خزانہ سینیٹر محمد اورنگزیب سے امریکا کے تجارتی نمائندے (یو ایس ٹریڈ) سفیر جیمیسن گریئر نے ورچوئل ملاقات کی جس میں پاکستان اور امریکا کے درمیان دوطرفہ تجارت اور اقتصادی تعاون کو مزید مضبوط بنانے کیلئے جاری مذاکرات میں ہونے والی پیش رفت کا جائزہ لیا گیا۔ وزیر خزانہ نے واشنگٹن ڈی سی میں ہونے والی حالیہ ملاقاتوں کا حوالہ دیتے ہوئے مذاکراتی ٹیموں کی جانب سے حاصل ہونے والی پیش رفت کا خیر مقدم کیا اور مذاکرات کے دوران دونوں فریقوں کے مثبت اور تعمیری انداز تعاون کو

بقیہ 28 صفحہ 3 پر

جموں وکشمیر کے تنازعہ کا منصفانہ اور پر امن حل پاکستان کی پالیسی کا بنیادی ستون ہے، شزا فاطمہ خواجہ

اسلام آباد (این این آئی) وفاقی وزیر آئی ٹی و ٹیلی کمیونیکیشن شزا فاطمہ خواجہ نے کہا ہے کہ بھارت کے غیر قانونی زیر تسلط جموں وکشمیر میں عوام کی حقیقی سیاسی قیادت کو مسلسل دبانا، شہری

بقیہ 27 صفحہ 3 پر

کشمیری خصوصی آئینی حیثیت ختم کرنے کا غیر قانونی اقدام ناقابل قبول ہے، خالد حسین مگسی

اسلام آباد (این این آئی) وفاقی وزیر برائے سائنس وٹیکنالوجی خالد حسین مگسی نے کہا ہے کہ بھارت کی جانب سے 5 اگست 2019 کو مقبوضہ جموں وکشمیر کی خصوصی آئینی حیثیت ختم کرنے کا غیر قانونی اقدام ناقابل قبول ہے اور پاکستان اس اقدام کو مسترد کرتا ہے۔ یوم استحصال کشمیر کے موقع پر اپنے پیغام میں انہوں نے کہا کہ کشمیر کے معاملے پر پاکستان کے اصولی موقف

بقیہ 25 صفحہ 3 پر

ڈپٹی چیئرمین سینیٹ کا کشمیری عوام کی حق خودارادیت کی جدوجہد کو خراج تحسین

بھارت کے غیر قانونی اقدامات عالمی قوانین کی کھلی خلاف ورزی، عالمی برادری جموں وکشمیر میں انسانی حقوق کی سنگین پامالیوں کا نوٹس لے، بیان

اسلام آباد (این این آئی) ڈپٹی چیئرمین سینیٹ سیدال خان ناصر نے کشمیری عوام کی حق خودارادیت کی جدوجہد کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ بھارت کے غیر قانونی اقدامات عالمی قوانین کی کھلی خلاف ورزی ہیں۔ یوم استحصال کشمیر کے موقع پر اپنے پیغام میں انہوں نے کہا کہ 5 اگست 2019ء تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے، جب بھارت نے یکطرفہ اور غیر قانونی اقدامات کے ذریعے جموں وکشمیر کی متنازعہ حیثیت کو تبدیل کرنے کی ناکام کوشش کی۔ انہوں نے کہا کہ یہ اقدامات اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی قراردادوں، بین الاقوامی قوانین اور انسانی حقوق کے مسلمہ اصولوں کی صریح خلاف ورزی ہیں،

بقیہ 24 صفحہ 3 پر

کشمیر کا ہر دکھ پاکستان کا دکھ، پوری قوم کشمیری بھائیوں اور بہنوں کے ساتھ کھڑی ہے، مصطفیٰ کمال

مقبوضہ جموں وکشمیر میں بنیادی انسانی حقوق کی مسلسل خلاف ورزیاں انتہائی تشویشناک ہیں، وفاقی وزیر

اسلام آباد (این این آئی) وفاقی وزیر برائے صحت مصطفیٰ کمال نے کہا ہے کہ مقبوضہ جموں وکشمیر میں بنیادی انسانی حقوق کی مسلسل خلاف ورزیاں انتہائی تشویشناک ہیں اور کشمیری عوام کئی دہائیوں سے ظلم وجبر کا سامنا کر رہے ہیں، کشمیر کا ہر دکھ پاکستان کا دکھ ہے اور پوری قوم اپنے کشمیری بھائیوں اور بہنوں کے ساتھ کھڑی ہے۔ یوم استحصال کشمیر کے موقع پر اپنے پیغام میں انہوں نے کہا کہ 5 اگست 2019 کو بھارت نے یکطرفہ اقدامات کے ذریعے اقوام متحدہ کی قراردادوں اور بین الاقوامی قوانین کی سنگین خلاف ورزی کی جس

بقیہ 29 صفحہ 3 پر

جموں وکشمیر کی خصوصی حیثیت ختم کر کے کشمیریوں سے ان کی شناخت چھیننے کی کوشش کی، وزراء

اسلام آباد (این این آئی) وفاقی وزرا اور حریت رہنماؤں نے کہا ہے کہ 5 اگست 2019 کو بھارت نے یکطرفہ طور پر جموں وکشمیر کی خصوصی حیثیت ختم کر کے کشمیریوں سے ان کی شناخت چھیننے کی کوشش کی، یہ یکطرفہ اقدام ناقابل قبول ہے جسے واپس لینا ہوگا، کشمیریوں نے اس بھارتی اقدام

بقیہ 30 صفحہ 3 پر

حق خودارادیت کے حصول تک کشمیریوں کی ہر سطح پر اخلاقی، سیاسی اور سفارتی حمایت جاری رکھے گا، بیرسٹر دانیال عزیز

بھارت طاقت، جبر یا یکطرفہ قانون سازی کے ذریعے مقبوضہ جموں وکشمیر کی بین الاقوامی سطح پر تسلیم شدہ متنازعہ حیثیت تبدیل نہیں کر سکتا، گفتگو

راولپنڈی (این این آئی) وفاقی پارلیمانی سیکرٹری برائے اطلاعات ونشریات بیرسٹر دانیال چوہدری نے کہا ہے کہ بھارت کی جانب سے 5 اگست 2019 کو بھارت کے غیر قانونی زیر تسلط جموں وکشمیر کی متنازعہ آئینی حیثیت تبدیل کرنے کا یکطرفہ اور غیر قانونی اقدام بری طرح ناکام ہو چکا ہے جسے کشمیری عوام نے یکسر مسترد کر دیا ہے، پاکستان کشمیری عوام کے ساتھ چٹان کی مانند کھڑا ہے اور حق خودارادیت کے حصول تک ان کی ہر سطح پر اخلاقی، سیاسی اور سفارتی حمایت جاری رکھے گا۔ ان خیالات کا اظہار انہوں نے بدھ کو یوم استحصال کشمیر کے سلسلے میں وقار النسا کالج، راولپنڈی میں منعقدہ تقریب سے خطاب کرتے

بقیہ 31 صفحہ 3 پر

اسلام آباد، وفاقی وزیر انجینئر امیر مقام یوم استحصال کشمیر کے موقع پر ڈی چوک میں نکالی جانے والی ریلی کی قیادت کر رہے ہیں

احسن اقبال کی زیر صدارت سی پیک جائزہ کمیٹی کا 91 واں اجلاس

اہم منصوبوں پر عملدرآمد میں تیزی لانے کی ہدایت

اسلام آباد (این این آئی) وفاقی وزیر برائے منصوبہ بندی، ترقی وخصوصی اقدامات پروفیسر احسن اقبال نے سی پیک جائزہ کمیٹی کے 91 واں اجلاس میں اہم منصوبوں پر عملدرآمد میں تیزی لانے کی ہدایت کی ہے۔ وفاقی وزیر برائے منصوبہ بندی، ترقی وخصوصی اقدامات پروفیسر احسن اقبال کی زیر صدارت سی پیک منصوبہ جات جائزہ کمیٹی اور قومی سٹیئرنگ کمیٹی کا 91 واں اجلاس اسلام آباد میں منعقد ہوا۔ اجلاس میں بنیادی ڈھانچے، توانائی، پیٹرولیم، آبی وسائل، خوراک و زراعت، مشترکہ ورکنگ گروپس (جے ڈبلیو جیز) اور خصوصی اقتصادی زونز سمیت مختلف شعبوں میں جاری منصوبوں پر پیش رفت کا تفصیلی جائزہ لیا

بقیہ 32 صفحہ 3 پر

اسلام آباد، وفاقی وزیر تجارت جام کمال خان اور ایرانی وزیر صنعت پاکستان۔ ایران جوائنٹ ٹریڈ کمیٹی کے 10 ویں اجلاس کے دستخط شدہ منٹس کا تبادلہ کر رہے ہیں

کوئٹہ، گورنر بلوچستان جعفر خان مندوخیل سے سابق صوبائی وزیر بابو محمد عمرانی ملاقات کر رہے ہیں

لورالائی، یوم شہدائے پولیس پر تقریب، پولیس تھانہ دوسڑکہ شہید جہانداد خان شبوزئی کے نام سے منسوب

شہدا کی قربانیاں قوم کا سرمایہ ہیں، لورالائی پولیس اپنے شہدا کے ورثا کے ساتھ ہر قدم پر کھڑی ہے، ڈی آئی

لورالائی (یو این اے) یوم شہدائے پولیس کے موقع پر لورالائی پولیس کی جانب سے ماضی قریب دہشت گرد حملے میں جام شہادت نوش کرنے والے شہید اے ٹی ایف اہلکار جہانداد خان شبوزئی کے گھر پر ایک پروقار تقریب کا انعقاد کیا گیا، جس میں تھانہ دوسڑکہ کو شہید جہانداد خان شبوزئی کے نام سے منسوب کرنے کا تاریخی فیصلہ کیا گیا۔ تقریب کے مہمان خصوصی ڈی آئی جی لورالائی رینج جنید احمد شیخ تھے، جبکہ ڈپٹی کمشنر کیپٹن (ر) محمد حبیب شجاع، ایس ایس پی ڈاکٹر فہد احمد، قبائلی عمائدین اور شہدا کے لواحقین نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ اس موقع پر ڈی آئی جی لورالائی رینج نے شہید کے اہل خانہ کے ہمراہ تھانے کے نئے نام کا باقاعدہ افتتاح کیا۔ مقررین نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ 4 اگست کا دن پولیس کے ان عظیم سپوتوں کی بے مثال قربانیوں کی یاد دلاتا ہے جنہوں نے وطن کے امن اور عوام کے تحفظ کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ مقررین نے اس عزم کا اعادہ کیا کہ شہدا کے ورثا کو کبھی تنہا نہیں چھوڑا جائے گا اور ان کی فلاح و بہبود پولیس کی اولین ترجیح ہے۔

کوئٹہ، گورنر بلوچستان جعفر خان مندوخیل سے مسلم لیگ ن کوئٹہ کے صدر سحر گل خان خلجی کی قیادت میں وفد ملاقات کر رہا ہے

نانجھی پور، صوبائی وزیر میر سلیم احمد خان کھوسہ کا صحبت پور کے عوام کے لیے عملی کردار قابلِ تحسین ہے

قدرتی آفات اور سیلاب میں عوام کے ساتھ کھڑے رہے، مسائل کے حل اور شہر کے تحفظ کے لیے بے مثال خدمات، عوامی حلقے

نانجھی پور (یو این اے) پاکستان مسلم لیگ (ن) کے پارلیمانی لیڈر اور صوبائی وزیر میر سلیم احمد خان کھوسہ کو ضلع صحبت پور کے عوام ہر مشکل وقت میں اپنے درمیان پاتے ہیں۔ چاہے قدرتی آفات ہوں، سیلاب کی تباہ کاریاں یا دیگر مشکلات، میر سلیم احمد خان کھوسہ نے ہمیشہ متاثرہ عوام کی مدد، بحالی اور مسائل کے حل کے لیے عملی کردار ادا کیا۔ سیلاب کے دوران انہوں نے اپنی ذاتی اور زرعی زمینوں کے بڑے حصے کو نقصان پہنچنے کے باوجود عوامی مفاد کو ترجیح دی اور صحبت پور شہر کو محفوظ بنانے کے لیے متعلقہ اداروں کے ساتھ مسلسل رابطے میں رہے۔ اس مشکل وقت میں وہ تقریباً تین ماہ تک متاثرہ علاقوں میں موجود رہے، امدادی سرگرمیوں کی نگرانی کی، متاثرین کی دادرسی کی اور بحالی کے کاموں میں بھرپور دلچسپی لی۔ جب سیلاب کے دوران وزیراعظم پاکستان نے ضلع صحبت پور کا دورہ کیا تو میر سلیم احمد خان کھوسہ نے ان کے سامنے علاقے کے مسائل، نقصانات اور

صحبت پور، پاکستان تحریک انصاف کے زیر اہتمام یوم سیاہ پر ریلی اور جلسہ

صحبت پور (یو این اے) پاکستان تحریک انصاف کی مرکزی کال پر صحبت پور میں "یوم سیاہ" منایا گیا، جس کے سلسلے میں مقامی ہوٹل سے ایک احتجاجی ریلی نکالی گئی اور بعد ازاں جلسے کا انعقاد کیا گیا۔ ریلی کی قیادت پی ٹی آئی کے ضلعی صدر ایڈووکیٹ ضیا کھوسو اور لیبر ونگ کے صوبائی نائب صدر ڈاکٹر حسین ناوڑا نے کی۔ جلسے سے خطاب کرتے ہوئے ضلعی صدر ایڈووکیٹ ضیا کھوسو، ڈاکٹر حسین ناوڑا، عبدالعزیز گولو اور دیگر رہنماؤں نے کہا کہ ملک کے مقبول ترین لیڈر اور سابق وزیراعظم عمران خان کو نااہل اور غیر قانونی طریقے سے جیل میں قید رکھا گیا ہے جبکہ ملک پر نااہل حکمران مسلط

بارکھان، رکھنی ٹول پلازہ پر ڈرائیور پر مبینہ تشدد، سریوں کے وار سے شدید زخمی

ٹرانسپورٹرز کی جانب سے غیر قانونی ٹیکس وصولی کا الزام، وزیراعلیٰ بلوچستان میر سرفراز بگٹی سے نوٹس اور ٹول پلازہ ختم کرنے کا مطالبہ

بارکھان (یو این اے) بارکھان کے علاقے رکھنی میں قائم ٹول پلازہ پر مبینہ غیر قانونی ٹیکس وصولی کے تنازع پر عملے کی جانب سے تشدد کا واقعہ سامنے آیا ہے، جہاں سریوں کے وار سے ایک ڈرائیور شدید زخمی ہو گیا۔ تفصیلات کے مطابق رکھنی ٹول پلازہ کے عملے نے مبینہ طور پر ایک ڈرائیور کو ... ٹرانسپورٹرز کا کہنا ہے کہ بلوچستان میں بدامنی کے باعث وہ پہلے ہی شدید مشکلات کا شکار ہیں، جبکہ اس ٹول پلازہ پر روزانہ کی بنیاد پر غیر قانونی ٹیکس وصولی اور ڈرائیوروں سے بدسلوکی کی جاتی ہے۔ ڈرائیوروں اور ٹرانسپورٹرز نے وزیراعلیٰ بلوچستان میر سرفراز بگٹی اور اعلیٰ حکام سے واقعے کا ...

کشمیریوں کی جدوجہد کو طاقت کے بل پر نہیں دبایا جا سکتا، میر مرتضیٰ خان جمالی

گنداخہ (یو این اے) چیئرمین مارکیٹ کمیٹی اوستا محمد میر مرتضیٰ خان جمالی نے یوم استحصال کشمیر کے موقع پر اپنے پیغام میں کہا ہے کہ 5 اگست کا دن بھارتی حکومت کے مقبوضہ جموں و کشمیر پر غیر قانونی قبضے، آئینی حیثیت کی منسوخی، ریاستی دہشت گردی اور انسانی حقوق کی سنگین پامالیوں کو دنیا کے سامنے بے نقاب کرنے کی ...

اوتھل، یونائیٹڈ فائبر انٹرنیٹ سروس کی دو دن سے معطلی، 400 سے زائد صارفین شدید پریشان

بار ہا شکایات کے باوجود انتظامیہ کا تسلی بخش جواب نہیں، پی ٹی اے اور ضلعی انتظامیہ سے فوری نوٹس کا مطالبہ

اوتھل (یو این اے) لسبیلہ کے ضلعی ہیڈکوارٹر اوتھل میں یونائیٹڈ فائبر انٹرنیٹ سروس صارفین کے لیے وبال جان بن گیا، دو دن سے سروس معطل، 400 کے قریب صارفین پریشان۔ تفصیلات کے مطابق لسبیلہ کے ضلعی ہیڈکوارٹر اوتھل میں یونائیٹڈ فائبر کی انٹرنیٹ سروس دو دن سے بند ... کرنے والے اور حبیب بلوچ اور اوتھل میں کمپنی کے نمائندوں سے متعدد بار رابطہ کیا۔ تاہم انہیں کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا۔ صارفین کا کہنا ہے کہ یونائیٹڈ فائبر کی انٹرنیٹ سروس اکثر بند رہتی ہے، جبکہ وہ باقاعدگی سے پیکجز کی ادائیگی کرتے ہیں۔ اس کے باوجود انہیں معیاری انٹرنیٹ سہولت فراہم ...

لورالائی، ڈسٹرکٹ آفیسر ایجوکیشن میڈم فوزیہ درانی یوم استحصال کشمیر کے حوالے سے ریلی کی قیادت کر رہی ہیں

عالمی برادری مقبوضہ کشمیر میں مظالم کا نوٹس لے، میر اعجاز خان سنجرانی

دالبندین (یو این اے) سابق صوبائی مشیر میر اعجاز خان سنجرانی نے کہا ہے کہ 5 اگست تاریخ کا وہ سیاہ باب ہے جب مقبوضہ جموں و کشمیر کی خصوصی آئینی حیثیت ختم کر کے کشمیری عوام کے بنیادی، سیاسی اور انسانی حقوق پر سنگین حملہ کیا گیا۔ انہوں نے کہا کہ اس یکطرفہ اقدام کے بعد لاکھوں کشمیری مسلسل کرفیو، مواصلاتی پابندیوں، سیاسی جبر، انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں اور دیگر مشکلات کا سامنا کر رہے ہیں، جس پر عالمی ضمیر کو بیدار ہونا چاہیے۔ یوم استحصال کشمیر کے موقع پر اپنے بیان میں میر اعجاز خان سنجرانی نے کشمیری عوام کے ساتھ مکمل یکجہتی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ ان کی بے مثال قربانیوں، ثابت قدمی، حوصلے اور ...

کوئٹہ، اسرائیل کی غزہ میں جارحیت پر 57 اسلامی ممالک کی خاموشی شرمناک ہے، رحیم کاکڑ

کوئٹہ (یو این اے) تحریک انصاف کے رہنما سابق سینیٹر کوئٹہ رحیم کاکڑ عمر فاروق ایڈووکیٹ نے اپنے مذمتی بیان میں دنیائے اسلام کے بناوٹی بے ضمیر 57 اسلامی ممالک کی بے حسی بے غیرتی اور ڈرپوک قیادت کے لیے عالم کفر دنیا بھر میں شرمندگی بزدلی کا آخری مقام ہے کہ اسرائیل نے غزہ میں فلسطین کے مسلمان بچوں کو دنیا میں سب سے بڑا قبرستان بنادیا ہے یہ فلسطینی مسلمانوں کی بزدلی نہیں ہے یہ انکی جرات قربانی کی دلیل ہے کہ فراڈ اسلامی ممالک کی بزدلی ڈرپوکی اور بے غیرتی کو دیکھ کر مذاق اڑا رہی ہے آج فلسطین کے ساتھ کوئی بھی نہیں کھڑا ہے سب عیاش بے غیرت اسلامی ممالک جو کہ کافروں سے بدتر ہیں وہ ڈرپوک دنیا عالم میں تماشائی ہیں سب ٹرمپ کے نوکر ہیں اللہ عزت والا ہے اللہ بے غیرتوں کو پسند نہیں کرتا اللہ ان 57 اسلامی ممالک کو بہت جلد برباد کرے ہمیں شرم آنی چاہیے کہ ہم ان بے غیرت ...

کوئٹہ، بی یو جے کا صحافی نذر علی کندرانی کے قتل پر شدید غم و غصے کا اظہار

... حسین ترین اور کابینہ ایگزیکٹو کونسل کے ممبران نے ڈیرہ اللہ یار میں ایک تنازعے کی بنیاد پر عوامی پریس کلب صحبت پور کے نائب صدر نذر علی کندرانی کے قتل کی شدید الفاظ میں مذمت کرتے ہوئے کی شفاف تحقیقات کرانے کا مطالبہ کیا ہے۔ بی یو جے قیادت نے کہا ہے کہ صحبت پور میں صحافی نذر علی کندرانی کو فائرنگ کر کے قتل کرنا انتہائی افسوسناک ہے۔ پوری صحافی برادری میں اس نقصان پر تشویش پائی جاتی ہے۔

ڈپٹی کمشنر عبداللہ کھوسہ، حسین کس جشن آزادی پاکستان کی تقریبات اور محکمہ مون سون بارشوں سے نمٹنے کے انتظامات کے حوالے سے اجلاس کی صدارت کر رہے ہیں

کوئٹہ، امریکہ کے اشاروں پر کشمیر کا سودا کسی صورت قبول نہیں ہے، جے یو آئی

آئین کی بالادستی اور تنظیمی استحکام کے لیے جدوجہد تیز کرنے کا عزم ہے، مولانا عبدالرحمٰن رفیق

کوئٹہ (یو این اے) جمعیت علماء اسلام ضلع کوئٹہ کے امیر مولانا عبدالرحمٰن رفیق اور سیکرٹری جنرل حاجی عین اللہ شمس نے کہا ہے کہ امریکہ کے اشاروں پر کشمیر کا سودا کسی صورت قبول نہیں کیا جائے گا، کشمیری عوام آج ہر طرف ظلم، جبر اور کشت و خون کا شکار ہیں، جبکہ امت مسلمہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان کی اخلاقی، سیاسی اور سفارتی حمایت جاری رکھے۔ دریں اثنا جمعیت شہید یونٹ بھوسہ منڈی کے تنظیمی اجلاس منعقد ہوئے۔ اجلاسوں میں جمعیت علماء اسلام ضلع کوئٹہ کے سینئر نائب امیر مولانا خورشید احمد، مولانا محب اللہ، حاجی بشیر احمد کاکڑ، مولانا محمد ایوب، حافظ رشید احمد، مولانا عبدالبصیر، حافظ مسعود احمد، مولانا محمد شعیب جدون، حاجی ولی محمد بڑیچ، مفتی محمد عارف شمشیر سیفہ اجمل بازئی، مولانا سید سعد اللہ آغا، حاجی ظفر اللہ ... یونٹ علی احمد خانزئی کشمیر آباد، ابوبکر صدیق یونٹ علی ہنگوئی، مفتی محمود یونٹ بزار گنجی، کلی عمر خان طور خان یونٹ، کلی کوتوال یونٹ، ابوبکر صدیق یونٹ بزار گنجی، ڈاکٹر خالد سومرو شہید یونٹ اختر آباد بزار گنجی، نجم المدارس یونٹ بزار گنجی، لہڑی آباد یونٹ بزار گنجی، ایمل کاسی شہید یونٹ کلی ابراہیم زئی، کلی خیزی یونٹ، مفتی زرولی خان یونٹ بھوسہ منڈی اور شاہ اسماعیل

وفاقی محتسب کے حکم پر درخواست گزار محمد اختر کو بجلی کے بل پر 20411 روپے کا ریلیف فراہم کروا دیا

کوئٹہ (این این آئی) وفاقی محتسب کے حکم پر درخواست گزار محمد اختر کو بجلی کے بل پر 20411 روپے کا ریلیف فراہم کروا دیا گیا۔ درخواست گزار محمد اختر نے بتایا کہ انہیں کیسکو آفس کی جانب سے گیس کا غیر منصفانہ بل موصول ہوا۔ جس کی درستگی کے لیے انہوں نے متعلقہ محکمے سے متعدد بار رابطہ کیا لیکن کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ لہٰذا، انصاف کے حصول کے لیے انہوں نے وفاقی محتسب کوئٹہ ...

ژوب، ترقیاتی فنڈز کی بندش اور تنخواہوں کی عدم ادائیگی پر بلوچستان کے بلدیاتی نمائندے سراپا احتجاج

مالی بحران کے خلاف منتخب نمائندے کل کوئٹہ پریس کلب میں آئندہ کے لائحہ عمل کا اعلان کریں گے، بلدیاتی نمائندوں کا اعلان

ژوب (یو این اے) میئرز، چیئرمینز، میونسپل کمیٹیز اور بلوچستان بھر کے منتخب بلدیاتی نمائندوں نے چیئرمینز، میئرز اور ڈپٹی میئرز کی تنخواہوں کی عدم ادائیگی پر شدید تشویش کا اظہار کیا ہے۔ اس سنگین صورتحال کے خلاف بلوچستان بھر کے منتخب بلدیاتی نمائندے کل بروز جمعرات، 6 اگست 2026، شام 5:00 بجے، کوئٹہ پریس کلب میں ایک ... صوبے کی تمام لوکل کونسلز کو ترقیاتی فنڈز (Development Funds) کی مسلسل بندش، نان سیلری بجٹ کی عدم فراہمی، اور گزشتہ چار ...

قومی احتساب بیورو کے زیر اہتمام یوم استحصال کشمیر کے موقع پر تقریب کا انعقاد

کوئٹہ (این این آئی) بھارت کے زیر قبضہ جموں و کشمیر کے غیور، بہادر اور مظلوم عوام کے ساتھ کامل یکجہتی کے اظہار کے لیے قومی احتساب بیورو (بلوچستان) میں "یوم استحصال کشمیر" نہایت احترام اور عزم کے ساتھ منایا گیا۔ یہ دن ہر سال 5 اگست کو "یوم سیاہ" کے طور پر منایا جاتا ہے تاکہ 5 اگست 2019 کو بھارتی حکومت کے ان یکطرفہ اور غیر قانونی اقدامات کے خلاف احتجاج ریکارڈ کرایا جا سکے، جن کے ذریعے آرٹیکل 370 اور 35-A کو ...

تربت، دہشت گردانہ حملے میں زخمی سیکیورٹی گارڈ کمپنی کی لاتعلقی کے باعث شدید مشکلات کا شکار

میگنم سیکیورٹی سروسز نے بہادر گارڈ کو علاج کے لیے لاوارث چھوڑ دیا، وزیراعلیٰ بلوچستان اور حکام سے فوری نوٹس کا مطالبہ

کوئٹہ (یو این اے) بلوچستان کے ضلع تربت میں فرائض کی انجام دہی کے دوران دہشت گردوں کے حملے میں شدید زخمی ہونے والے میگنم سیکیورٹی سروسز (Magnum Security Services Pvt Ltd) کے گارڈ، امجد بلوچ اس وقت شدید مالی اور طبی مشکلات کا شکار ہیں، جبکہ ان کی کمپنی نے مشکل کی اس گھڑی میں ... مطابق، دھرتی ٹی وی کوئٹہ کے رپورٹر الطاف حسین بلوچ نے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ میرے چھوٹے بھائی امجد بلوچ میگنم سیکیورٹی سروسز میں بطور سیکیورٹی گارڈ ملازم ہے اور تربت، بلوچستان کے انتہائی حساس علاقے میں اپنی ڈیوٹی سرانجام دے رہے تھے۔ ڈیوٹی کے دوران اچانک دہشت گردوں کی جانب سے سیکیورٹی پوزیشن پر حملہ کیا ... حکومت پاکستان سے منظور شدہ ہونے کا دعویٰ کرتی ہے اور جس کا لائسنس نمبر 3001100001890004 ہے، نے اپنے اس بہادر ملازم کو ہسپتال منتقل ہونے کے بعد اکیلا چھوڑ دیا ہے۔ متاثرہ گارڈ کے مطابق کمپنی کی جانب سے علاج معالجے کے اخراجات میں کوئی تعاون نہیں کیا جا رہا۔

کوئٹہ، ڈائریکٹر جنرل تعلقات عامہ بلوچستان عسکر خان (KPIs) کے حوالے سے منعقدہ اجلاس کی صدارت کر رہے ہیں

جعفر آباد، ضلعی انتظامیہ کے زیرِ اہتمام استحصال کشمیر ریلی، ڈی سی آفس سے گھنٹہ گھر چوک تک مارچ

بھارت نے کشمیر کا استحصال کر کے غاصب ہونے کا ثبوت دیا، وادی میں بھارتی مظالم کا سلسلہ جاری ہے

جعفر آباد (یو این اے) ضلعی انتظامیہ جعفر آباد کے زیر اہتمام یوم استحصال کشمیر کے موقع پر ایک عظیم الشان ریلی کا انعقاد کیا گیا، جس میں سرکاری افسران اور شہریوں نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ استحصال کشمیر ریلی کی قیادت ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر حضور بخش بگٹی نے کی۔ ریلی کے شرکا نے لگائے۔ اس موقع پر مظلوم کشمیری مسلمانوں سے مکمل یکجہتی کا اظہار کرتے ہوئے ایک منٹ کی خاموشی بھی اختیار کی گئی۔ ریلی سے خطاب کرتے ہوئے ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر حضور بخش بگٹی نے کہا کہ بھارت نے مقبوضہ کشمیر کی خاص حیثیت ختم اور غاصبانہ استحصال کر کے اپنے ظالم ہونے کا بین ثبوت دیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ وادی کشمیر میں آج بھی بھارتی فورسز کے مظالم جاری ہیں، تاہم کشمیریوں کی جدوجہد کو دبایا نہیں جا سکتا۔ ... ڈی سی آفس سے گھنٹہ گھر چوک تک پیدل مارچ کیا اور کشمیر کی آزادی و پاکستان سے الحاق کے حق میں "کشمیر بنے گا پاکستان" کے پرجوش نعرے ...

لینڈ سلائیڈنگ و بارشوں سے متاثرہ این 45 اور شاہراہ ریشم سمیت اہم شاہراہیں ٹریفک کے لیے بحال کر دیں

اسلام آباد (این این آئی) نیشنل ہائی وے اتھارٹی (این ایچ اے) کی ٹیموں نے لینڈ سلائیڈنگ اور بارشوں سے متاثرہ شاہراہوں کی بحالی کا کام مکمل کرتے ہوئے این 45- اور شاہراہ ریشم سمیت ملک کی تمام اہم شاہراہوں کو ٹریفک کے لیے دوبارہ کھول دیا ہے۔

مستونگ، موٹر سائیکل چھیننے کی کوشش ناکام، شہری کی فائرنگ سے مبینہ ڈاکو ہلاک ہو گئے

مستونگ (یو این اے) مستونگ کے علاقے کھنڈ کے قریب موٹر سائیکل چھیننے کی کوشش کے دوران شہری کی فائرنگ سے ایک مبینہ ڈاکو موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔ ذرائع کے مطابق ڈاکو ایک شہری سے موٹر سائیکل چھیننے کی کوشش کر رہے تھے کہ متاثرہ شہری نے ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مزاحمت کی اور فائرنگ کر دی، جس کے نتیجے میں ایک مبینہ ڈاکو موقع پر ڈھیر ہو گیا ...

اسلام جنگ کے والد کے قتل کی شدید مذمت، بی این پی کا جوڈیشل کمیشن تشکیل دینے کا مطالبہ

بلوچستان ہائی کورٹ شفاف تحقیقات کے لیے اقدامات کرے، میر عبدالرؤف مینگل

خضدار (یو این اے) بلوچستان نیشنل پارٹی کے مرکزی رہنما سابق ایم این اے میر عبدالرؤف مینگل نے اپنے جاری کردہ مذمتی بیان میں اسلام جنگ کے والد کے بہیمانہ قتل کی شدید الفاظ میں مذمت کرتے ہوئے کہا ہے کہ اسلام جنگ اور ان کا خاندان گزشتہ طویل عرصے سے خوف، ہراس اور مسلسل دھمکیوں کے سائے میں زندگی گزارنے پر مجبور ہیں انہوں نے کہا کہ کچھ عرصہ قبل خضدار کے علاقے شہزاد سٹی پولیس لائن میں رات کی تاریکی میں اسلام جنگ کے گھر پر حملہ کر کے انہیں اغوا کیا گیا اور اہل خانہ کو دبا میں لا کر زبردستی نکاح کرانے کی کوشش کی گئی، تاہم جھالاوان سمیت بلوچستان بھر کے عوام کی مزاحمت اور شدید عوامی ردعمل کے نتیجے میں اسلام جنگ کو بازیاب کرایا گیا۔ ایڈووکیٹ فریدہ بلوچ نے کہا کہ ظہور جمال زئی اور اس کے خاندان کو بااثر قبائلی شخصیات اور صوبائی حکومت کی سرپرستی حاصل ہونے کے باعث وہ مسلسل قانون کی گرفت سے باہر رہے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ مذکورہ خاندان پر قتل، تشدد، دھمکیوں اور دیگر سنگین جرائم میں ملوث ہونے کے الزامات موجود ہیں۔

ایمنسٹی انٹرنیشنل کا بانی پی ٹی آئی اور بشریٰ بی بی کی اہلخانہ اور وکلا سے ملاقات کرانے کا مطالبہ

اسلام آباد (این این آئی) ایمنسٹی انٹرنیشنل نے بانی پی ٹی آئی اور ان کی اہلیہ بشریٰ بی بی کی اہلخانہ اور وکلا سے غیر مشروط ملاقات کرانے کا مطالبہ کیا ہے۔ جنوبی ایشیا کے لیے ایمنسٹی انٹرنیشنل کی قائم مقام علاقائی ڈائریکٹر ازابیل لاسی نے اپنے بیان میں کہا کہ 3 برس سے بانی پی ٹی آئی کو قیدِ تنہائی میں رکھ کر منصفانہ سماعت، طبی سہولتوں اور ...

جعفر آباد، ڈیرہ اللہ یار کے لیڈیز بازار میں مسلح افراد کی فائرنگ، ایک شخص جاں بحق اور ایک زخمی

جعفر آباد (یو این اے) ڈیرہ اللہ یار کے شہر لیڈیز بازار میں مسلح افراد کی اندھا دھند فائرنگ کے نتیجے میں ایک شخص جاں بحق جبکہ ایک شدید زخمی ہو گیا۔ واقعہ کی اطلاع ملتے ہی پولیس نے فوری کارروائی کرتے ہوئے ایک ملزم کو اسلحہ سمیت گرفتار کر لیا۔ ڈی ایس پی سرکل طالب حسین لاشاری کے مطابق نامعلوم افراد نے لیڈیز بازار میں اچانک فائرنگ کی ...

چمن، مولانا فضل الرحمٰن ملک میں جمہوریت اور آئینِ پاکستان کی بالادستی کا باوقار چہرہ ہیں، حافظ محمد صدیق مدنی

قائد جمعیت نے ہمیشہ سیاسی مکالمے اور جمہوری جدوجہد کے ذریعے قوم کی رہنمائی کی، سابق ممبر قومی اسمبلی

چمن (یو این اے) جمعیت علماء اسلام چمن بلوچستان کے رہنما اور سابق ممبر قومی اسمبلی مولوی حافظ محمد صدیق مدنی نے کہا ہے کہ قائد جمعیت علماء اسلام پاکستان حضرت مولانا فضل الرحمٰن مدظلہ برصغیر کے ممتاز دینی و سیاسی رہنماؤں میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے اپنی پوری زندگی دینِ اسلام کی سربلندی، آئینِ پاکستان کی بالادستی، جمہوری اقدار کے فروغ، پارلیمانی روایات کے استحکام اور عوامی حقوق کے تحفظ کے لیے وقف کر رکھی ہے۔ ... فعال اور عوامی جماعت بنانے میں ان کی شبانہ روز محنت اور قربانیاں ناقابلِ فراموش ہیں۔ حافظ محمد صدیق مدنی نے مزید کہا کہ دینی مدارس کے تحفظ، اسلامی تشخص کے فروغ، نوجوان نسل کی فکری و اخلاقی تربیت، محروم طبقات کی آواز بلند کرنے اور قومی معاملات میں مثبت کردار ادا کرنے کے حوالے سے مولانا فضل الرحمٰن کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ ...

کوئٹہ، قلعہ سیف اللہ کے تھانوں سے اسلحہ واپس لینے پر پشتونخوا نیپ کا شدید احتجاج اور تشویش کا اظہار

حکومت کا یہ اقدام عوام کو عدم تحفظ کا شکار اور امن دشمن عناصر کو سہولت فراہم کرنے کے مترادف ہے، صوبائی سیکرٹریٹ

کوئٹہ (یو این اے) پشتونخوا نیشنل عوامی پارٹی ... بیان میں کہا گیا کہ پولیس اسٹیشن قلعہ سیف اللہ، مسلم باغ، کان مہترزئی، شنائی، مرغہ فقیر زئی، لوئی بند، بادینی، شران جوگیزئی، کنگی، اخترزئی، باتوزئی ... ان تھانوں کو غیر فعال اور بے اختیار بنایا جا رہا ہے، جبکہ عوام کو دہشت گردوں اور مسلح جتھوں کے رحم و کرم پر چھوڑا جا رہا ہے۔ بیان میں کہا گیا کہ یہ انتہائی افسوسناک امر ہے کہ جن علاقوں میں ماضی میں لیویز فورس کے تھانے موجود تھے اور بعد ازاں انہیں عوام کی مرضی و منشا کے برخلاف پولیس تھانوں میں تبدیل کیا گیا۔

بیلا، ڈسٹرکٹ کرکٹ ایسوسی ایشن لسبیلہ کی جنرل باڈی کا پہلا اجلاس

عبدالحکیم نائب صدر اور سلیمان ابراہیم روجھو جوائنٹ سیکرٹری منتخب، صدر میر اسحاق زہری کی زیر صدارت اجلاس میں تمام ممبران کی شرکت

بیلا (یو این اے) ڈسٹرکٹ کرکٹ ایسوسی ایشن لسبیلہ کی جنرل باڈی کا پہلا اجلاس الحاج غلام قادر کرکٹ اسٹیڈیم بیلا میں صدر میر اسحاق زہری کی صدارت منعقد ہوا۔ اجلاس کا باقاعدہ آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا ... سلیمان ابراہیم روجھو کا اس کے بعد میر اسحاق زہری نے ایجنڈے کے مطابق اجلاس ... جائے گا۔ تمام ممبران نے ڈسٹرکٹ کرکٹ ایسوسی ایشن لسبیلہ کی کابینہ کو یہ اختیار دیا کہ آپ جو فیصلہ کریں ...

ڈی، اسسٹنٹ کمشنر چوتھائی عبدالسلام شاہوانی یوم استحصال کشمیر کے حوالے سے ریلی کی قیادت کر رہے ہیں

خضدار، بلوچستان فوڈ اتھارٹی کی دو تلوار ایریا میں اچانک کارروائی

ایرانی سکم ملک پاؤڈر سے تیار کردہ غیر معیاری دہی ضبط، دکانداروں کو بھاری جرمانے، ڈپٹی ڈائریکٹر ڈاکٹر عبدالباسط

خضدار (یو این اے) ڈپٹی ڈائریکٹر بلوچستان فوڈ اتھارٹی قلات زون ڈاکٹر عبدالباسط کی سربراہی میں قلات زون کی ٹیم نے خضدار کے دو تلوار ایریا میں متعدد ملک شاپس پر اچانک کارروائی کی۔ کارروائی کے دوران ایران سے درآمد شدہ غیر معیاری اور غیر منظور شدہ سکم ملک پاؤڈر سے تیار کیا گیا دہی بڑی مقدار میں برآمد کر لیا گیا، جسے موقع پر ضبط کر لیا گیا۔ معائنے کے دوران فوڈ سیفٹی قوانین کی سنگین خلاف ورزیاں سامنے آنے پر متعدد ملک شاپس کو موقع پر ہی سیل کر دیا گیا، جبکہ دیگر دکانداروں پر بھاری جرمانے عائد کیے گئے اور انہیں سخت تنبیہ کی گئی۔ اس موقع پر انجمن تاجران کے صدر منیر احمد قرانی بھی موجود تھے۔ انہوں نے کہا کہ بعض دکاندار خالص دودھ اور معیاری دہی فروخت کرنے کے بجائے غیر معیاری اور مشکوک مصنوعات کے ذریعے شہریوں کی صحت سے کھیل رہے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ایسے عناصر عوام کو خوراک نہیں بلکہ زہر فراہم کر رہے ہیں، لہٰذا ان کے خلاف سخت اور بلا امتیاز کارروائی وقت کی اہم ضرورت ہے۔

چمن سکاؤٹس کے کمانڈنٹ بریگیڈیئر ضیا، پولیس شہدا یادگار پر پھولوں کی چادر چڑھاتے ہوئے

کوئٹہ، طاقت اور پابندیاں کشمیریوں کے جذبہ آزادی کو متزلزل نہیں کر سکتیں، امین الدین بازئی ایڈووکیٹ

بھارتی مظالم کے باوجود کشمیری عوام حق خودارادیت کے لیے ثابت قدم ہیں، پاکستان ہر فورم پر ان کی حمایت جاری رکھے گا

کوئٹہ (یو این اے) سابق ڈپٹی اٹارنی جنرل امین الدین بازئی ایڈووکیٹ نے کہا ہے کہ طاقت، جبر اور پابندیاں کشمیری عوام کے عزم اور جذبہ آزادی کو متزلزل نہیں کر سکتیں، بھارتی قابض افواج کے مظالم کے باوجود کشمیری عوام اپنے جائز حق خودارادیت کے حصول کے لیے ثابت قدم ہیں، یوم استحصال کشمیر پر مظلوم کشمیری عوام کے ساتھ مکمل اور غیر متزلزل یکجہتی کا اعادہ کرتے ہیں بدھ کو یوم استحصال کشمیر پر اپنے پیغام میں سابق ڈپٹی اٹارنی جنرل امین الدین بازئی ایڈووکیٹ نے کہا کہ کشمیری عوام کی بہادری، ثابت قدمی اور حق خودارادیت کے لیے منصفانہ جدوجہد کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ بھارت کے 5 اگست 2019 کے غیر قانونی اور یکطرفہ اقدامات کو سات برس مکمل ہو چکے ہیں، بھارت نے بین الاقوامی قوانین اور اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی قراردادوں کی کھلی خلاف ورزی کی، بھارتی غیر قانونی اقدامات جموں و کشمیر کی بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ متنازع حیثیت تبدیل نہیں کر سکتے انہوں نے کہا کہ پاکستان کشمیری عوام کی اخلاقی، سیاسی اور سفارتی حمایت ہمیشہ ...

مینار پاکستان پر جلسے کی درخواست مسترد، متبادل جگہ کی اجازت سے متعلق ہدایات لے کر پیش ہونے کا حکم

لاہور (این این آئی) لاہور ہائیکورٹ میں پاکستان تحریک انصاف کی 5 اگست کو مینار پاکستان پر جلسے کی اجازت سے متعلق درخواست پر سماعت ہوئی۔ جسٹس مرزا وقاص رؤف نے پی ٹی آئی رہنما میاں عثمان اکرم کی درخواست پر سماعت کی۔ دوران سماعت سرکاری وکیل نے عدالت کو بتایا کہ مینار پاکستان پر جلسے کی درخواست مسترد کر ...

بہاولنگر، خاتون سے زیادتی کے ملزم کو زخمی حالت میں گرفتار کر لیا گیا

بہاولنگر (این این آئی) چک چاویکا کے قریب مبینہ پولیس مقابلے کے دوران ڈکیتی اور خاتون سے زیادتی کرنے والے ملزم کو زخمی حالت میں گرفتار کر لیا گیا، 2 ملزمان فرار ہو گئے۔ پولیس کے مطابق مقابلے کے دوران ملزم اپنے ہی ساتھیوں کی فائرنگ سے زخمی ہوا، پولیس حراست میں ملزم کو برآمدگی کے لیے لے جایا جا رہا تھا۔

کوہلو، سپچاڑ کے رہائشی کا پولیس اہلکار اور کلرک کے خلاف 17 لاکھ روپے کے فراڈ کا الزام، پریس کانفرنس

ٹیوب ویل ریلیف کے پیسے دوسرے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرائے گئے، وزیراعلیٰ بلوچستان سے کارروائی اور رقم بحالی کا مطالبہ

کوہلو (یو این اے) سپچاڑ کوہلو کے رہائشی محمد حسین لوہارانی مری نے کوہلو پریس کلب میں پریس کانفرنس کرتے ہوئے کہا کہ میرے بھائی فیروز کے نام پر آئی فیڈ ٹیوب ویلز ریلیف کی مد میں 20 لاکھ روپے آئے تھے چونکہ میرا بھائی بیمار تھا بعدازاں دنیا سے رحلت فرما گئے چھ سات ماہ گزرنے کے بعد جب میں نے کیسکو حکام، ڈپٹی کمشنر آفس سے رجوع کیا کہ میرے بھائی کے نام پر پیسے آئے ہیں وہ دیئے جائیں تو انہوں مختلف بہانے بنائے جب میں نے کیسکو ایکسین لورالائی اور کوئٹہ سے انرجی ڈیپارٹمنٹ میں جانچ پڑتال کیا تو معلوم ہوا کہ آپ کے پاس ریلیز ہو چکے ہیں اور نکالے بھی گئے کافی جدوجہد کے بعد معلوم ہوا کہ میرے پیسے منور اللہ نامی شخص جو ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ میں ملازم ہے اسکے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہوئے ہیں جب میں اس کے پاس گیا تو انہوں نے اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ بابو حنیف جو پولیس اہلکار ہے ڈی سی آفس کوہلو میں کلرک کا کام سرانجام دے رہا ہے انہوں نے مجھے اکاؤنٹ میں منگایا میرے اکاؤنٹ میں 20 لاکھ ٹرانسفر کئے تین لاکھ مجھے دیئے اور 17 لاکھ خود لے گیا جب میں نے ڈپٹی کمشنر سے کیس کیلئے درخواست دی تو کوئی شنوائی نہیں ہوئی میں اس پریس کانفرنس کی توسط سے واضح کرنا چاہتا ہوں کہ حنیف پولیس اہلکار میرے 17 لاکھ کا قرض دار ہے اگر میری شنوائی نہیں ہوئی تو بلوچی رسم و رواج کے مطابق لونگا میں حکام بالا وزیراعلیٰ بلوچستان و دیگر سے گزارش کرتا ہوں نہ صرف انکو ضلع بدر کیا جائے بلکہ میرا حق ان سے لے کر دیا

ایل اے 27 مظفر آباد ون پر (ن) لیگ، ایل اے 28 مظفر آباد 2 پر پیپلز پارٹی کامیاب

مظفر آباد (این این آئی) آزاد جموں و کشمیر قانون ساز اسمبلی کے دوسرے مرحلے کے انتخابات کے غیر سرکاری اور غیر حتمی نتائج کے مطابق ایل اے 27 مظفر آباد ون پر مسلم لیگ (ن) کے امیدوار نورین عارف جبکہ ایل اے 28 پر پیپلز پارٹی کے امیدوار بازل علی نقوی نے بازی مار لی۔ مظفر آباد ڈویژن کے حلقے ایل اے 27 آباد ون اور ایل اے 28 مظفر آباد ٹو کے 57 پولنگ اسٹیشنز پر 2 اگست کو موسم اور لینڈ سلائیڈنگ کے باعث پولنگ ملتوی کی گئی تھی۔

ڈیرہ بگٹی، پیرکوہ میں یوم استحصال کشمیر پر پروقار تقریب اور ریلی، 5 اگست کے بھارتی اقدامات کی شدید مذمت

پاکستانی قوم کشمیری عوام کے حق خودارادیت کی جدوجہد میں ہمیشہ ان کے شانہ بشانہ کھڑی رہے گی، مقررین

ڈیرہ بگٹی (یو این اے) ضلع ڈیرہ بگٹی میں یوم استحصال کشمیر کے موقع پر گورنمنٹ ہائی اسکول پیرکوہ میں ایک پروقار تقریب اور بعد ازاں یکجہتی ریلی کا انعقاد کیا گیا۔ تقریب میں ونگ کمانڈر پیرکوہ کرنل سید واجد شاہ، اسسٹنٹ کمشنر پریم کمار، ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر شاہ نواز بگٹی، قبائلی عمائدین، اساتذہ اور طلبہ نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے مقررین نے 5 اگست 2019 کو بھارت کی جانب سے مقبوضہ کشمیر کی خصوصی حیثیت سے متعلق آرٹیکل 370 اور 35-A کی منسوخی کی شدید الفاظ میں مذمت کرتے ہوئے اسے کشمیری عوام کے بنیادی حقوق پر سنگین حملہ قرار دیا۔ انہوں نے اس عزم کا اعادہ کیا کہ پاکستانی قوم کشمیری عوام کی حق خودارادیت کی جدوجہد میں ہمیشہ ان کے ساتھ کھڑی رہے گی۔

عمرکوٹ میں چھوٹے بھائی نے مبینہ طور پر بڑے بھائی کو قتل کر دیا

عمرکوٹ (این این آئی) سامارو کے گاؤں ابراہیم سینجرو میں چھوٹے بھائی نے مبینہ طور پر بڑے بھائی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ پولیس کے مطابق غلام سینجرو نامی شخص اپنے بڑے بھائی کی نعش متعلقہ ہسپتال لایا تھا، جس کی گردن اور سینے پر 2 گولیاں لگنے کے نشان ہیں۔

خضدار، صدر پولیس کی ڈکیتی اور چوری کے ملزمان کے خلاف کارروائی، مطلوب ملزم سمیع اللہ گرفتار

گن پوائنٹ پر موٹر سائیکل چھیننے والا ملزم 24 گھنٹے کے اندر گرفتار، پسٹل اور موٹر سائیکل برآمد، ایس ایچ او محمد یوسف چانڈیو

خضدار (یو این اے) صدر پولیس کی ڈکیتی اور چوری میں مطلوب افراد کے خلاف بھرپور کارروائیاں جاری۔ تفصیلات کے مطابق صدر پولیس کی کارروائیاں مزید تیز ایس ایچ او صدر محمد یوسف چانڈیو اور پولیس ٹیم نے چھاپہ مار کارروائی کرتے ہوئے چوری ڈکیتی میں مطلوب ملزم سمیع اللہ کو گرفتار کر کے ملزم کے قبضے سے پسٹل اور ڈکیتی میں استعمال ہونے والا موٹر سائیکل برآمد کر کے ملزم کو گرفتار کر کے تفتیش شروع کر دی۔ یاد رہے ملزم نے گزشتہ روز بالیدہ کلتان ایریا سے گن پوائنٹ پر موٹر سائیکل چھین کر فرار ہوا تھا جسے 24 گھنٹے کے اندر ایس ایچ او نے گرفتار کر لیا۔

اورناڑہ اور ماڑہ میں بجلی بریک ڈاؤن پر آل پارٹیز اور شہری نمائندوں کی چیئرمین میونسپل کمیٹی سے اہم ملاقات

کیسکو حکام کی تمام فنی خرابیاں دور کرنے اور بجلی کی بلاتعطل فراہمی کی یقین دہانی، چیئرمین محفوظ بلوچ

اورناڑہ (یو این اے) اورناڑہ میں بجلی کے بریک ڈاؤن پر آل پارٹیز اور شہری نمائندوں کی چیئرمین میونسپل کمیٹی سے اہم ملاقات اور ماڑہ شہر میں رات کے اوقات میں بجلی کی تاریں گرنے اور مسلسل بریک ڈاؤن کے باعث شہریوں کو درپیش مشکلات کا نوٹس لیتے ہوئے آل پارٹیز اور ماڑہ، انجمن تاجران اور ماڑہ عوامی اتحاد کے وفد نے میونسپل کمیٹی کے چیئرمین محفوظ بلوچ سے ملاقات کی اور صورتحال کی سنگینی سے آگاہ کیا۔ شہری نمائندوں کی جانب سے عوامی مسائل کی نشاندہی پر چیئرمین میونسپل کمیٹی محفوظ بلوچ نے

کوئٹہ، نیشنل پارٹی کے مرکزی صدر ڈاکٹر عبدالمالک بلوچ، مرکزی سیکرٹری جنرل میر کبیر محمد شہی، اسلم بلوچ، یحییٰ بلوچ، رحمت صالح بلوچ، چنگیز حئی بلوچ، کلثوم نیاز بلوچ نیشنل پارٹی میں پنجگور کے سیاسی و سماجی شخصیات حسین شاہ بلوچ اور دیگر نیشنل پارٹی کے زیر اہتمام شمولیت کے موقع پر اسٹیج پر بیٹھے ہیں

باقاعدہ تصدیق شدہ اشاعت وزارت اطلاعات و نشریات حکومت پاکستان
ABC CERTIFIED
Daily AAINA Quetta
روزنامہ آئینہ کوئٹہ
قیمت 5 روپے
بانی: منصور الہدیٰ عباسی
ریذیڈنٹ ایڈیٹر فہیم ارسلان خلیل
چیف ایڈیٹر عامر امیر اعوان
ایڈیٹر فیصل کریم
03332831889 ✵ Daily.aaina94@gmail.com

چیف ایڈیٹر و پبلشر عامر امیر اعوان نے روزنامہ آئینہ کوئٹہ سینچری پرنٹرز پرائیویٹ لمیٹڈ سے چھپوا کر دفتر 9-13/28 پاکستان لائن کواری روڈ کوئٹہ سے شائع کیا

دریائے ڈینیوب کے کنارے

سرور منیر را

سفر انسان کو صرف نئی دنیا سے متعارف نہیں کراتا بلکہ اپنے وطن کو ایک نئے زاویہ نگاہ سے دیکھنے کا موقع بھی فراہم کرتا ہے۔ میں برطانیہ اور یورپ کے مطالعاتی دورے پر ہوں، یورپ کے دل میں واقع ہنگری کی دارالحکومت بوداپیسٹ ان چند شہروں میں شامل ہے جو اپنے حسن سے زیادہ اپنی تہذیب، اپنے نظم اور اپنی اجتماعی دانش سے متاثر کرتے ہیں۔

یہ شہر دیکھنے والے کو محض خوبصورت عمارتوں، تاریخی قلعوں اور دلکش مناظر کا تحفہ نہیں دیتا بلکہ ایک خاموش پیغام بھی دیتا ہے کہ قومیں وسائل سے نہیں، رویوں سے عظیم بنتی ہیں۔ دریائے ڈینیوب کا نیلگوں پانی صدیوں سے اس شہر کی رگوں میں زندگی دوڑا رہا ہے۔ ایک کنارے پر پہاڑیوں میں آباد بودا ہے اور دوسرے کنارے پر جدید شہری زندگی کا مرکز پیسٹ۔ ان دونوں کو ملانے والے پل صرف دو کناروں کو نہیں بلکہ ماضی اور حال کو بھی جوڑتے ہیں۔

بوداپیسٹ کی گلیوں میں چلتے ہوئے بار بار یہ احساس ہوتا ہے کہ ترقی کا راز صرف بلند و بالا عمارتوں یا جدید انفراسٹرکچر میں نہیں بلکہ شہری شعور میں پوشیدہ ہے۔ یہاں ٹریفک کا شور کم اور قانون کی آواز زیادہ سنائی دیتی ہے۔

سڑکیں صاف ہیں، عوامی نقل و حمل منظم ہے، تاریخی ورثہ محفوظ ہے اور شہری اپنی ذمے داری کو ریاست پر احسان نہیں بلکہ اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ یہی وہ چھوٹی چھوٹی اقدار ہیں جو کسی بھی قوم کی بڑی کامیابیوں کی بنیاد بنتی ہیں۔

ہنگری کی تاریخ میں بڑے اتار چڑھاو رہے ہیں۔ سلطنتوں کے عروج و زوال، دو عالمی جنگوں کی تباہ کاریوں، کمیونسٹ نظام اور سیاسی تبدیلیوں کے طویل ادوار کے باوجود اس قوم نے مایوسی کو اپنی شناخت نہیں بننے دیا۔ انھوں نے ماضی کو محفوظ رکھا مگر مستقبل کو اسیر نہیں ہونے دیا۔ یہی وہ سوچ ہے جس نے بوداپیسٹ کو یورپ کے خوبصورت ترین اور باوقار دارالحکومتوں میں شامل کر دیا۔ ایک پاکستانی کی حیثیت سے جب میں اس شہر کو دیکھتا ہوں تو میرے ذہن میں مسلسل اپنے وطن کا نقشہ ابھرتا ہے۔ پاکستان بھی قدرتی حسن، نوجوان آبادی، تاریخی ورثے اور بے شمار امکانات سے مالا مال ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ترقی یافتہ قومیں قانون کو طاقتور بناتی ہیں جب کہ ترقی پذیر معاشروں میں اکثر طاقتور قانون سے بالاتر دکھائی دیتے ہیں۔ یہی فرق قوموں کی رفتار کا تعین کرتا ہے۔ یہ کہنا درست نہیں کہ یورپ کے پاس صرف وسائل زیادہ ہیں۔ اصل سرمایہ ان کا ادارہ جاتی استحکام، تعلیم، تحقیق، شفاف حکمرانی اور اجتماعی نظم ہے۔ جب معاشرہ قانون کی بالادستی کو اپنی اجتماعی ثقافت بنا لیتا ہے تو پھر دریا بھی خوشحالی لاتے ہیں، پل بھی ترقی کی علامت بنتے ہیں اور شہر بھی دنیا کے لیے کشش کا مرکز بن جاتے ہیں۔ ڈینیوب کے کنارے کھڑے ہو کر مجھے بار بار دریائے سندھ یاد آیا۔ دریا تو دونوں عظیم ہیں، پانی بھی دونوں کا زندگی بخشتا ہے لیکن اصل فرق ان معاشروں کی ترجیحات میں ہے۔۔

دہشت گردی کا خاتمہ اب قریب ہے؟

عثمان دموہی

اس میں شک نہیں کہ اس وقت وطن عزیز مختلف الاقسام کے مسائل کا شکار ہے، سب سے بڑا چیلنج ملکی سلامتی کو درپیش ہے۔ ہمارا دشمن وطن عزیز کے قیام کے وقت سے ہی ہماری آزادی کو ختم کرنے کے درپے ہے۔ اسی دشمن کے تعاون سے ملک میں دہشت گردی نے ایک ہنگامی صورت حال پیدا کر دی ہے۔

دہشت گردی اور روز بہ روز بڑھتی ہوئی مہنگائی سے کون سا پاکستانی ہوگا جو پریشان نہیں ہوگا، مگر ایسے وقت میں سب سے اہم ہی نہیں بلکہ ہماری ملکی سلامتی کے لیے ایک تاریخی اہمیت کا واقعہ رونما ہوا ہے، وہ ہماری قوم کے غیر متزلزل اتحاد کا مظہر ہے، ہماری قوم ویسے تو ہمیشہ سے ہی متحد ہے مگر حال ہی میں ملک کے جید علما کرام نے ایک ساتھ اور ایک پیش امام کی اقتدا میں نماز ادا کر کے ملک میں قومی یکجہتی کا بے مثال مظاہرہ کیا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ ہماری یکجہتی نہ صرف ہماری بقا بلکہ ہمارے ملک کی سلامتی کی ضامن ہے۔ ہمارے علما اور قوم کی یکجہتی کو دیکھ کر یقیناً ہمارا دشمن نہ صرف گھبرا گیا ہوگا بلکہ وہ اپنے مذموم مقاصد کو بھی اب ناقابل عمل سمجھنے لگا ہوگا۔ اس وقت بلوچستان میں دہشت گردی کے مسئلے نے ملک و قوم کو سخت پریشان کر رکھا ہے۔ اس نے دشمن کو ضرور خوش کیا ہوگا مگر اس کے ساتھ ہی ہماری حکومت نے دہشت گردی کے خلاف آپریشن شعبان شروع کر کے دشمن کو نہ صرف موجودہ بلکہ آئندہ کی دہشت گردی کے منصوبوں پر سوچ و بچار میں ڈال دیا ہوگا۔

اس وقت آپریشن شعبان پوری طاقت اور دلیری سے جاری ہے اور اس کے نتیجے میں اب تک متعدد دہشت گرد جہنم واصل ہو چکے ہیں۔ اس آپریشن نے یقیناً دشمن کے لیے ایک نئی مصیبت کھڑی کر دی ہے کیونکہ اب دہشت گردوں کے لیے پہاڑوں میں چھپنا اور وہاں کئی کئی دن بسیرا کرنا مشکل ہو گیا ہے۔

پہلے یہ ہوتا تھا کہ دہشت گردوں کے خلاف جب بھی کارروائی کی جاتی تھی وہ پہاڑوں پر جا کر چھپ جاتے تھے لیکن اب دہشت گردوں کے لیے زمین تو زمین، پہاڑ بھی محفوظ نہیں رہے ہیں۔ اس طرح اب ان کے لیے کوئی محفوظ جگہ نہیں رہی ہے۔

اس سے اب دہشت گردی کو سپورٹ کرنے والے ملک میں موجود وطن دشمن بھی بہت ناامید ہوئے ہوں گے اور اب دہشت گردوں کے لیے حقیقت میں کوئی محفوظ جگہ نہیں رہی ہے، البتہ اب وہ سول آبادی میں ضرور اپنی کمین گاہیں بنا سکتے ہیں مگر لگتا ہے ایسا کر کے وہ اپنے پیروں پر کلہاڑی ماریں گے کیونکہ بلوچستان کے عوام جو ان کی دہشت گردی سے تنگ آ چکے ہیں، ان کی موجودگی کی اطلاع ضرور خفیہ ایجنسیوں تک پہنچائیں گے۔

یہ تو حقیقت ہے کہ اس بھارت اور افغانستان اسپانسرڈ دہشت گردی سے بلوچستان کے عوام سخت پریشان ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ اس دہشت گردی کا ایسا سر کچلا جائے کہ یہ پھر کبھی صوبے کی ترقی اور ان کے جان و مال کے لیے خطرہ نہ بن سکے مگر یہ شاید ہماری ماضی کی حکومتوں کی کوتاہی رہی کہ وہ اس فتنے کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سدباب کرنے میں زیادہ سرگرم نہیں رہی ہیں۔ یہ شاید اس لیے بھی ہوا ہے کہ وہاں کے بااثر سیاسی وڈیرے ہماری حکومتوں کو دہشت گردوں کا مکمل صفایا کرنے سے روکتے رہے ہیں، یہ لوگ دہشت گردوں کے اصل محافظ اور مددگار خفیہ طور پر بنے رہے ہیں۔ یہ دہشت گرد آزادی کی بات کرتے ہیں، یہ دوسرے ملک کے کرائے کے دہشت گرد پہلے خود کو تو دشمن ملک کی غلامی سے آزاد کرا لیں پھر بلوچستان کا سوچیں۔

ان دہشت گردوں کو سی پیک منصوبے کو دراصل ناکام بنانے کے لیے ہائر کیا گیا ہے، حالانکہ بلوچستان کے لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ سی پیک منصوبہ ان کے خوشحال اور تابناک مستقبل کا ضامن ہے مگر بس یہی بات ان دہشت گردوں کے آقاں کو چبھتی ہے کہ اگر بلوچستان خوشحال ہو گیا تو پھر ان کے پاکستان مخالف پراپیگنڈے کا کیا بنے گا اور پھر اگر ایسا ہوا تو ان کی تو دکانیں ہی بند ہو جائیں گی، کیوں کہ دشمن انھیں اس وقت جو نواز رہا ہے وہ ساری نوازشات بھی ختم ہو جائیں گی چنانچہ سی پیک منصوبے کو مکمل ہونے اور گوادر بندرگاہ کو پاکستان کی سب سے بڑی، اہم اور مصروف بندرگاہ بنانے کے منصوبے کو روکنا ان کے لیے ان کی روزی روٹی کا معاملہ بن گیا ہے۔ بلوچستان کے دانشور اس بات کو خوب جانتے ہیں۔ وہ ساری صورت حال اور دشمن کے ہتھکنڈوں کو خوب سمجھتے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں ان کے صوبے کو دہشت گردی کے ذریعے بدحال رکھنے کا ایک مقصد مقبوضہ کشمیر میں آزادی کی تحریک کی مدد کرنے کا پاکستان سے بدلہ لینا ہے مگر پاکستان تو سلامتی کونسل کی قراردادوں کے مطابق اپنا فرض ادا کر رہا ہے، اگر دشمن بلوچوں کو آزادی ہی دلانا چاہتا ہے تو پھر صرف پاکستانی بلوچوں پر ہی مہربان کیوں ہے، وہ ایران اور افغانستان میں بٹے بلوچی علاقوں کے بلوچوں کو کیوں نظرانداز کر رہا ہے؟

مگر دہشت گرد آقاں کے انداز سے واضح ہے کہ ان کا افغانستان یا ایران کے بلوچ علاقوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ دہشت گردی صرف پاکستان کے لیے ہے مگر کیوں؟ اس وقت آپریشن شعبان بھرپور انداز سے جاری ہے مگر کسی کو اس میں رکاوٹ نہ ڈالنے دی جائے۔ بی ایل اے، طالبان کی بھی مدد کر رہے ہیں مگر اب افغانستان میں طالبان کے ظلم و ستم کے خلاف ایک نئی جاندار تحریک شروع ہو چکی ہے جس سے طالبان کا ظلم اور دہشت گردی سے بھرپور اقتدار اب ختم ہوتا نظر آ رہا ہے۔

جوان دریاؤں کے کنارے آباد ہیں۔ سوال یہ نہیں کہ ہمارے پاس کیا نہیں بلکہ سوال یہ ہے کہ جو کچھ ہمارے پاس ہے، کیا ہم اسے دیانت، نظم اور وژن کے ساتھ بروئے کار لا رہے ہیں؟

بوداپیسٹ میرے لیے صرف ایک سیاحتی منزل نہیں بلکہ ایک فکری تجربہ ہے۔ اس شہر نے مجھے یہ احساس دلایا کہ تہذیب صرف عجائب گھروں میں محفوظ نوادرات کا نام نہیں بلکہ روزمرہ زندگی میں قانون کی پاسداری، صفائی، برداشت، وقت کی قدر اور قومی مفاد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دینے کا نام ہے۔ سفر ختم ہو جائے گا، تصاویر محفوظ ہو جائیں گی، یادیں بھی وقت کے ساتھ دھندلا جائیں گی مگر بوداپیسٹ کا ایک سوال شاید ہمیشہ میرے ساتھ رہے گا: اگر ایک قوم جنگوں، بحرانوں اور سیاسی اتار چڑھاو کے باوجود اپنے شہروں کو دنیا کے لیے مثال بنا سکتی ہے تو کیا پاکستان اپنی بے پناہ صلاحیتوں کے باوجود ایسا نہیں کر سکتا؟

شاید اس سوال کا جواب ہم سب کو مل کر تلاش کرنا ہوگا۔

شخصیات پختونخوا

سعداللہ جان برق

شخصیات پختونخوا یہ روخان یوسفزئی کی تازہ ترین تالیف ہے جو اردو میں چھپی ہے اور اس وقت میرے سامنے پڑی ہے۔ روخان یوسفزئی کے بارے میں جب بھی کچھ کہنے یا لکھنے کا موقع آتا ہے تو یہی کہتا ہوں کہ میں اس میں ہمیشہ خود کو دیکھتا ہوں۔ جن دشوار گزار راستوں، جان لیوا اونچ نیچ اور بے پناہ کٹھنائیوں سے میں گذر کر آیا ہوں، ویسے ہی راستوں سے روخان یوسفزئی بھی گزر کر آیا ہے۔

بقول منیر نیازی:

اک اور دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو
میں اک دریا کے پار اترا تو میں نے دیکھا

اور یہ دریا پانی کے نہیں تھے اور نہ ہی ہمیں کوئی کشتی یا سفینہ میسر تھا بلکہ یہ جگر مرادآبادی کے دریا تھے یا قرۃالعین حیدر کے۔

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

لیکن یہ عشق کے دریا بھی نہیں تھے، ظالم زندگی کے ظالم دریا تھے۔ طرح طرح کی محرومیوں، مجبوریوں اور مزدوریوں کا ایک طویل سفر تھا۔ ہم دونوں کا تعلق اس طبقے سے ہے، جسے ہینڈ ٹو ماؤتھ کہتے ہیں۔ پشتو میں اس کے لیے کہا جاتا ہے، کہ

کتہ باندے کٹوئی باندے
کتہ کوزہ کٹوئی لاندے

ترجمہ) بوجھ سر پر تو ہانڈی بھی چولہے پر۔ بوجھ اتارا تو ہانڈی بھی چولہے سے اتری۔ روزانہ بونا، روزانہ کاٹنا اور روزانہ کھانا (دونوں کا اس طبقے سے تعلق نہیں جو اجداد کی کمائیوں پر عیش کرتے ہیں اور ہاتھ پیر ہلائے بغیر سب کچھ پا لیتے ہیں لیکن کہتے ہیں کہ ہر اچھائی میں برائی اور ہر برائی میں اچھائی کا کوئی نہ کوئی پہلو بھی ہوتا ہے، اگر کوئی اسے ڈھونڈ پائے تو Flora& Fauna۔

اس پر مشقت، پر صعوبت اور پر مجبوری جدوجہد کا اچھا پہلو یہ ہے کہ انسان زندگی کو، انسانوں کو اور دنیا کو بہت قریب سے دیکھ لیتا ہے، بھوگ لیتا ہے اور پوری طرح پہچان لیتا ہے کہ کس پردے کے پیچھے کیا بلکہ کیا کیا ہے۔

کس کس نیکی کے پیچھے کیا کیا برائیاں ہیں اور کس برائی کے پیچھے کیا اچھائیاں ہوتی ہیں اور کتنے چھوٹے چھوٹے لوگوں کے اندر کتنے بڑے بڑے لوگ ہوتے ہیں اور کتنے بڑے بڑے لوگ کتنے چھوٹے ہوتے ہیں۔ جھونپڑوں اور کھنڈروں میں کتنے بڑے بڑے ہیرے مل جاتے ہیں اور کن کن عالیشان محلات میں کتنے بدرنگ، بدبودار کنکھجورے ہوتے ہیں۔

اب مثال کے طور زیادہ تر لوگ تو جب کوئی بولتا ہے تو سچ اور جھوٹ کو پہچان لیتے ہیں لیکن ہم کسی کے بولنے سے پہلے جان لیتے ہیں کہ اب یہ کونسا جھوٹ یا سچ بولے گا۔ اور روخان یوسفزئی نے تو بہت سارے شخصیات کو کتابوں کی طرح پڑھا ہے، جانتا ہے کہ خوبصورت مجلد منقش جلدوں کے اندر کیا ہے اور سستی، کم قیمت قسم کی غیر مجلد اور پھٹی پرانی نظر آنے والی کتابوں میں کیا کیا کچھ ہے اور آج کا معاشرہ تو یوں بن چکا ہے کہ اسے اگر شوکیسوں کا زمانہ کہیے تو بجا ہوگا کہ تقریباً پچاس فیصد لوگ گھر سے نکلتے ہوئے ایک شوکیس بن کر یا ایک شوکیس پہن کر نکلتے ہیں۔ مرشد نے بھی کہا ہے کہ

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکہ یہ بازیگر کھلا

اور یہ پتہ تب چلتا ہے جب انسان چہروں کو پڑھنے کا علم حاصل کرتا ہے۔ اور روخان یوسفزئی نے یہ علم بھرپور طریقے پر حاصل کیا ہے کہ اس کی عمر ہی چہروں کو پڑھنے میں گزری ہے۔ چہروں کا سلسلہ بھی آج کل کچھ عجیب سا بن گیا ہے۔

بازار میں مصنوعی چہروں کی اتنی بھرمار ہو گئی ہے کہ اصل چہرہ صرف وہی پہچان سکتے ہیں جن کی عمر، روخان کی طرح چہرے پڑھنے میں گزری ہے ورنہ حالت یہ ہو گئی ہے کہ بڑے روشن چہروں کے پیچھے انتہائی بھیانک چہرے چھپے ہوتے ہیں۔

دوسری طرف ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے کہ فرقہ ملامتیہ کے صوفی ہوتے ہیں جو دکھاتے کم اور کرتے زیادہ ہیں، بظاہر معمولی لیکن حقیقت میں خاص، بہت ہی خاص ہوتے ہیں۔ کام کرتے ہیں، نام کی پروا نہیں کرتے، نہ ستائش کی تمنا رکھتے ہیں نہ صلے کی پروا اور روخان یوسفزئی کی اس کتاب میں بھی ایسی شخصیات کی کمی نہیں جو بظاہر ملنگ اور درویش لگتے ہیں لیکن حقیقت میں شاہ و شہنشاہ ہوتے ہیں، ایسے ہی لوگوں کے لیے احمد فراز نے کہا ہے کہ

ڈھونڈ اجڑے ہوئے لوگوں میں وفا کے موتی
یہ خزانے تجھے ممکن ہے خرابوں میں ملیں

کاکروچ جنتا

جاوید قاضی

بھارتی سپریم کورٹ کے چیف جسٹس نے غصے کا اظہار کرتے ہوئے جین زی کو کروچ قرار دیا

اندرا گاندھی نے اپنے دور حکومت میں ہندوستان میں ایمرجنسی نافذ کی تھی۔ ان کی حکومت کے بعد کسی ڈکٹیٹر نے نہیں بلکہ ایسی ایمرجنسی نریندر مودی نے لاگو کی۔ مودی صاحب کے اس اقدام کو ہندوستان کی جین زی (Gen Z) نے چیلنج کر دیا ہے۔

پتہ یہ چلا ہے کہ ہندوستان میں اظہار رائے کی آزادی اور احتجاج کرنے کے بنیادی اور آئینی حقوق منجمد تھے۔

وزیراعظم نریندر مودی حکومت نے نوجوانوں کے اس احتجاج کو پرزور طریقے سے روکا۔ یاد رہے کہ بھارتی سپریم کورٹ کے چیف جسٹس نے غصے کا اظہار کرتے ہوئے جین زی کو کروچ قرار دیا۔

اس لفظ کے بعد یہ ایسے متحد ہوئے جس کا گمان بھی نہ تھا۔ یہ کاکروچ جنتا پارٹی، پارلیمنٹ میں اپوزیشن سے زیادہ مودی صاحب کے خلاف طاقتور ہو گئی۔ اس بات کا اندازہ بھی نہ تھا، ایک ایسی پارٹی جو رجسٹرڈ بھی نہیں ہے اور نہ ہی اس پارٹی کے لیے اب تک کوئی عہدیدار نامزد ہوا ہے لیکن ان کا جنون ہے۔ اب یہ نوجوان اس میدان میں اکیلے نہیں ہیں کیونکہ راہول گاندھی اور ان کی بہن پریانکا گاندھی بھی ان کی حمایت کر رہی ہیں۔ یقیناً ارونددھتی رائے بھی ان کی حمایتی ہوں گی، اسی طرح ابھیجیت دکپے، سورو داس، آفرین نواز، دیپک بلیان، رتنا سنگھ اور سونم وانچک جیسے لوگ جو سیکولر ہندوستان کی سوچ رکھتے ہیں، وہ تمام لوگ اس پارٹی کی حمایت کریں گے۔

اس کا نتیجہ کیا ہوگا کچھ کہنا قبل از وقت ہے، مگر اپنی گیارہ برس کی حکومت میں مودی صاحب نے اپنے خلاف ایسی مزاحمت کا سامنا پہلی بار کیا ہے جو کاکروچ جنتا پارٹی نے ان کے خلاف شروع کی ہے۔ آخر کار انھیں اپنے وزیر تعلیم سے استعفا لینا پڑا۔

یہ پارٹی نوجوانوں کی پارٹی ہے اور جین زی پر مشتمل ہے، یہ پارٹی سوشل میڈیا کی پاور ہے۔ مصنوعی ذہانت کی پیداوار ہے۔ ہندوستان، امریکا اور چین کے بعد دنیا کا تیسرا بڑا ملک ہے جہاں مصنوعی ذہانت اپنی مضبوط جڑیں بنا رہی ہے۔ اب جین زی کو ہندو انتہا پرستی کے بیانیے سے کنٹرول نہیں کیا جا سکتا، پاکستان دشمنی میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کی آگ کو نہیں بھڑکایا جا سکتا۔

ایسا ہی انقلاب کچھ سال قبل سری لنکا میں بھی آیا تھا۔ اس انقلاب کا ہراول دستہ بھی جین زی تھے۔ بنگلہ دیش اور نیپال میں بھی نوجوان سڑکوں پر نکلے۔ آج سے پندرہ سال پہلے ایسے ہی احتجاج عرب ممالک میں بھی ہوئے جو تحریر اسکوائر پر جا ٹھہرے لیکن پھر Spring Revolution آگے بڑھ نہ سکا، وہ اس لیے کہ اس انقلاب میں مسلم معاشروں میں قائم نظریاتی دیواریں توڑنے کی صلاحیت نہیں تھی۔

ہندوستان ایک سیکولر ملک تھا مگر ایل کے ایڈوانی نے اس سیکولر ازم کی بنیادیں ہلا دیں۔ اس نے تیس سال قبل گجرات سے یاترا کا آغاز کیا اور ہزاروں میل سفر طے کر کے ایودھیا (اتر پردیش) میں بابری مسجد کو مسمار کروایا، جہاں اب ایک سیکولر ملک کے وزیراعظم یعنی مودی صاحب نے ریاست کی نگرانی میں رام مندر بنوایا۔ مودی کے لیے ہندوستان کو یرغمال بنانا اتنا آسان نہیں۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد ہندوستان کو فوراً آئین دے دیا گیا۔ جہاں مسلسل جمہوریت رائج رہی سوائے اس دور کے جب اندرا گاندھی نے ہندوستان پر ایمرجنسی لاگو کی۔ ہندوستان کی سپریم کورٹ کے فل بنچ نے کیشوانندا کیس جیسے عظیم عدالتی فیصلے نے روکا۔ اندرا گاندھی کے فاشزم کو روکا۔ اس کیس کی پیروی کیشوانندا بھارتی، کلدیپ نیر اور کئی سیکولر سول سوسائٹی کے ممبران کی تھی جو پابند سلاسل ہوئے۔

مجھے یہ گمان ہے کہ احتجاج کی یہ لہر ہندوستان تک محدود نہیں رہے گی بلکہ اس کی پہنچ اور رسائی سرحد پار تک جائے گی۔ ہندوستان کی جمہوریت اور خارجہ پالیسی جس کی بنیادیں جواہر لعل نہرو نے رکھی تھیں، ان بنیادوں کو مودی نے جس طرح سے ہلایا ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت اور ڈیڑھ ارب کی آبادی والے ملک کو ایک کروڑ کی آبادی والے ملک اسرائیل کے ساتھ لاکھڑا کیا ہے۔ مودی سرکار نے مہاتما گاندھی کے ہندوستان کس قدر چھوٹا بنا دیا۔

ہم فرض کرتے ہیں کہ جو تضادات آزادی کے وقت مسلمان اور ہندوؤں کے درمیان پیدا ہوئے، وہ تضادات اگر نہ ہوتے تو آج ہندوستان اور پاکستان امن سے رہ رہے ہوتے۔ ہمارے ان تضادات نے بر صغیر میں غربت پھیلا دی۔ سامراجی طاقتوں نے ہماری دشمنی کو استعمال کر کے ہمیں قرضوں کے جال میں پھنسا دیا۔ ہمیں سرد جنگ میں دھکیل کر اپنے مقاصد حاصل کیے۔

تاریخ کروٹ بدلتی ہے، اپنی لے میں چلتی ہے۔ چین کو برطانیہ اپنا غلام نہیں بنا سکا۔ ان زمانوں میں چین، برطانیہ کا غلام بن جاتا تو کیا ہوتا؟ ایران بھی کسی کا غلام نہ بن سکا۔ یہ غلامی جو ہندوستان کے اوپر مسلط ہوئی وہ اورنگزیب کے کمزور دور کا شاخسانہ تھی History۔

اورنگزیب بادشاہ نے سیکولر بنیادوں کو ہلایا۔ ہندوستان کمزور ہوا، دارا شکوہ کی موت نے شاہی خاندان کو تقسیم کر دیا، اندرونی بغاوتوں نے سر اٹھایا، سکھوں نے بغاوت کی، مرہٹوں نے بغاوت کی، پھر اس طرح پلاسی کے بعد ٹیپو سلطان کی شہادت ہوئی۔

دہلی پر محمد شاہ رنگیلے جیسے حکمرانوں کی حکمرانی قائم ہوئی، پھر ایران کے بادشاہ نادر شاہ نے شمالی ہند کے شہروں اور راج دھانی دلی پر حملہ کیا۔ ہندوستان میں قتل و غارت اور لوٹ مار کا بازار گرم ہوا، ہر طرف انارکی، لاقانونیت اور وار لارڈز کا راج تھا، اسی دور ابتلا و انتشار میں رہی کسر احمد شاہ ابدالی کی آمد اور لوٹ مار و قتل و غارت نے نکال دی۔

اس وقت ہندوستان بیسیوں بلکہ سیکڑوں راجواڑوں میں تقسیم تھا، اگر سازشوں کے جال بن کر ہمیں غلامی کے طوق نہ پہنائے جاتے تو آج ہم دنیا کی عظیم طاقت ہوتے۔ یہ تاریخ کے بے رحم فیصلے تھے۔

پاکستان کے تاریخی پس منظر میں جو پاکستان کی سب سے بڑی بدنصیبی تھی وہ تھی آئین کی غیر موجودگی۔ پھر جنرل ضیا الحق کا آنا جس نے سیکولر پاکستان کی بچی کچی بنیادوں کو مسمار کر دیا۔ ہندوستان کی آزاد دانشور ارونددھتی رائے، جو سیکولر ہندوستان کا نظریہ رکھتی ہیں اور مانی شنکر یہ گمان کرتے ہیں کہ ہندوستان کے سیکولرازم کو جنرل ضیا الحق کی انتہا پرست بیانیہ نے نقصان پہنچایا، کیونکہ ہندوستان کے انتہا پرست ہندو سیاست میں کبھی طاقتور نہیں بن سکے تھے۔ انھوں نے ہندوستان کی سیاست میں جنرل ضیا الحق کا ماڈل متعارف کروایا۔ آج اس ماڈل کو مودی صاحب لے کر چلے ہیں۔ پہلے گجرات میں ہندو مسلم کش فسادات کروائے، مسلمانوں کی نسل کشی کی گئی اور آج پورے ہندوستان میں مسلمان اور اقلیتیں غیر محفوظ ہیں۔ جین زی نے کاکروچ جنتا پارٹی کی بنیاد رکھ کر، مودی کی نفرت اور انتہا پرستی کے بیانیہ کو چیلنج کر دیا ہے۔

جین زی، دراصل ہندوستان کو RSS سے آزاد کروانا چاہتی ہے۔ وہ اس حق میں ہندوستان ایک سیکولر ملک تھا اور دوبارہ ہندوستان میں سیکولرازم آنا چاہیے۔ مصنوعی ذہانت کی ٹیکنالوجی کے بعد ہندوستان کے اندر ان کی جمہوریت اس دنیا میں اپنے راستوں کا تعین کر رہی ہے۔

جمہوریت صرف اکثریت کی حکمرانی نہیں بلکہ اقلیت کے حقوق کی حفاظت کا نام بھی ہے۔ امبیڈکر نے اسی خطرے کی طرف اشارہ کیا تھا کہ آئین کی کامیابی اس کے الفاظ سے زیادہ اس پر عمل کرنے والوں کے کردار پر منحصر ہے۔

ہندوستان کے موجودہ حالات کو اسی وسیع تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ حکومتیں بدلتی رہتی ہیں، جماعتیں بنتی اور بکھرتی رہتی ہیں، رہنما آتے اور چلے جاتے ہیں مگر قوموں کی اصل طاقت ان کے عوام ہوتے ہیں، اگر عوام کے دل میں اعتماد باقی رہے تو ریاست مضبوط رہتی ہے۔۔

عوام کی طاقت

زاہدہ حنا

تاریخ کے اوراق پلٹتے ہوئے بارہا یہ احساس ہوتا ہے کہ اقتدار کی سب سے بڑی غلط فہمی یہی ہوتی ہے کہ وہ خود کو دائمی سمجھنے لگتا ہے۔ رویے بدلنے لگتے ہیں، حفاظتی حصار مضبوط ہوتے جاتے ہیں، دربار چاپلوسوں سے بھرنے لگتا ہے اور حکمرانوں کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ کچھ کر لیں، عوام اندھوں کی طرح ان کی پوجا کریں گے، مگر تاریخ کبھی کسی ایک فرد، کسی ایک جماعت یا کسی ایک اقتدار کی جاگیر نہیں رہی۔

اس کی نبض ہمیشہ عوام کے ہاتھ میں رہی ہے، وہ عوام جو بظاہر کمزور ہوتے ہیں، منتشر دکھائی دیتے ہیں مگر جب اپنے حق، اپنی عزت اور اپنی آزادی کے لیے کھڑے ہو جائیں تو دنیا کی بڑی سے بڑی طاقتیں بھی ان کے سامنے بے بس ہو جاتی ہیں۔

ہمارے پڑوسی ملک ہندوستان میں آج جو سیاسی بے چینی دکھائی دے رہی ہے، اسے صرف ایک جماعت یا ایک رہنما کے تناظر میں نہیں دیکھنا چاہیے۔ اصل سوال اس سے کہیں بڑا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جمہوریت کیا صرف انتخابات کا نام ہے یا پھر جمہوریت عوام کے اعتماد، اختلاف رائے کے احترام، اداروں کی آزادی اور شہریوں کی آواز سے اپنا وجود حاصل کرتی ہے؟ اگر عوام کو صرف ووٹ ڈالنے کا حق ملے مگر سوال پوچھنے کا حق چھن جائے تو کیا جمہوریت اپنی روح برقرار رکھ سکتی ہے۔

برصغیر کی آزادی کی جدوجہد ہمیں یہی سبق دیتی ہے۔ برطانوی سامراج دنیا کی سب سے بڑی طاقتوں میں شمار ہوتا تھا۔ اس کے پاس فوج تھی، سرمایہ تھا، قانون تھا اور دنیا بھر پر حکومت کرنے کا غرور بھی۔ مگر اس کے مقابلے میں کھڑے ہونے والے عام لوگ تھے۔

کسان، مزدور، طالب علم، عورتیں، ادیب اور بے شمار گمنام انسان۔ ان کے ہاتھوں میں بندوقیں نہیں تھیں مگر ان کے دلوں میں آزادی کی خواہش تھی۔ آخر کار فتح اسی خواہش کی ہوئی۔ شاید اسی لیے گاندھی جی عوام کی اخلاقی قوت پر یقین رکھتے تھے اور ڈاکٹر بھیم راامبیڈکر بار بار یہ یاد دلاتے تھے کہ آئین صرف کتاب کا نام نہیں بلکہ ایک زندہ سماجی معاہدہ ہے جس کی حفاظت عوام کے شعور سے ہوتی ہے۔ اقتدار کی ایک عجیب نفسیات ہوتی ہے، وہ اپنے گرد ایسے لوگوں کا ہجوم جمع کر لیتا ہے جو ہر فیصلے کو درست اور ہر نعرے کو مقبول ثابت کرتے رہتے ہیں۔ یوں حکمران یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ خاموشی رضامندی ہے، اختلاف سازش ہے اور اکثریت ہمیشہ ان کے ساتھ رہے گی، لیکن تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ خاموشی کے اندر کبھی کبھی برسوں کا غصہ، مایوسی اور بے بسی پل رہی ہوتی ہے جو ایک دن اچانک عوامی طاقت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

دنیا کی تاریخ ایسی مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔ عرب دنیا میں ایک معمولی سے سبزی فروش کی بے بسی نے ایسی آگ بھڑکائی جسے دنیا نے عرب اسپرنگ کے نام سے یاد کیا۔ تیونس سے اٹھنے والی یہ لہر، مصر، لیبیا، یمن اور شام تک پہنچی۔ ہر ملک کا انجام مختلف تھا۔ کہیں آمریتیں ختم ہوئیں، کہیں خانہ جنگی نے امیدوں کو نگل لیا، کہیں نئے اقتدار نے پرانے نظام کی جگہ لے لی لیکن ایک حقیقت پوری دنیا نے دیکھی کہ جب لاکھوں لوگ سڑکوں پر آ جائیں تو اقتدار کے مضبوط سے مضبوط ستون بھی لرزنے لگتے ہیں۔ عوامی مزاحمت ہر بار مثالی انجام تک نہیں پہنچتی مگر وہ یہ ضرور ثابت کرتی ہے کہ خوف ہمیشہ کے لیے انسان کو خاموش نہیں رکھ سکتا۔

بنگلہ دیش کی حالیہ عوامی تحریک نے بھی یہی سبق دیا۔ طلبہ ہوں یا عام شہری، جب معاشی مشکلات، سیاسی جبر اور ناانصافی ناقابل برداشت ہو جائے تو لوگ اپنے گھروں سے نکلتے ہیں۔ تحریک کے نتائج پر مختلف آرا ہو سکتی ہیں لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ عوامی قوت نے ایسے اقتدار کو بھی ہلا کر رکھ دیا جو خود کو مضبوط اور ناقابل شکست سمجھتا تھا۔ اقتدار بدل جائے یا نہ بدلے، عوام کی خاموشی ضرور ٹوٹ جاتی ہے اور یہی کسی بھی جمہوریت کا سب سے اہم لمحہ ہوتا ہے۔ سری لنکا کی تصویر ابھی زیادہ پرانی نہیں ہوئی۔ معاشی بحران نے جب عام آدمی کی زندگی اجیرن کر دی، بجلی، ایندھن، خوراک اور دوائیں نایاب ہونے لگیں تو لوگ سڑکوں پر نکل آئے۔ دنیا نے دیکھا کہ صدارتی محل جو کبھی طاقت کی علامت سمجھا جاتا تھا، عوام کے قدموں کی آہٹ سے خالی ہو گیا۔ اس سے تمام مسائل حل نہیں ہوئے، نہ ہی بحران ایک دن میں ختم ہوا لیکن یہ منظر تاریخ میں محفوظ ہو گیا کہ عوام کے سامنے اقتدار کی دیواریں ہمیشہ قائم نہیں رہتیں۔

پھر امریکا کی Occupy Wall Street تحریک کو کون بھول سکتا ہے، وہ کوئی انقلاب نہیں تھا، نہ اس نے حکومت گرائی اور نہ سرمایہ داری کا نظام بدل دیا، لیکن اس نے دنیا کو ایک نیا سوال دیا۔ اس نے بتایا کہ اگر دولت چند ہاتھوں میں سمٹ جائے، اگر معیشت عام انسان کے بجائے صرف طاقتور طبقات کی خدمت کرنے لگے تو احتجاج صرف غریب ملکوں میں نہیں ہوتا، دنیا کی سب سے طاقتور معیشت میں بھی لوگ سڑکوں پر آتے ہیں۔ بعض تحریکیں اقتدار نہیں گراتیں مگر شعور کو بیدار کر دیتی ہیں اور شعور کی بیداری اکثر کسی بھی سیاسی تبدیلی سے زیادہ دیرپا ثابت ہوتی ہے۔ ان تمام مثالوں میں ایک قدر مشترک ہے۔ نتائج مختلف تھے، راستے مختلف تھے، کامیابیاں اور ناکامیاں بھی مختلف تھیں مگر عوام کی طاقت ہر جگہ ایک حقیقت بن کر سامنے آئی۔ عوام ہمیشہ ہر جنگ نہیں جیتتے مگر ان کے سامنے کوئی اقتدار ہمیشہ کے لیے نہیں ٹھہرتا۔ مزاحمت کبھی فوری فتح نہیں لاتی لیکن وہ حکمرانوں کے اس یقین کو ضرور توڑ دیتی ہے کہ ان کی طاقت ہمیشہ قائم رہے گی۔

ہندوستان دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کہلاتا ہے۔ اس کی اصل طاقت اس کی آبادی نہیں بلکہ اس کا تنوع ہے۔ مختلف مذاہب، زبانیں، ثقافتیں اور نظریات ایک ہی آئینی چھت کے نیچے جمع ہیں۔ یہی ہندوستان کا حسن بھی ہے اور اس کی آزمائش بھی۔ جب اختلاف کو دشمنی میں بدل دیا جائے، جب سوال کو بغاوت سمجھ لیا جائے اور جب تنقید کو غداری کا نام دیا جائے تو جمہوریت کی روح کمزور ہونے لگتی ہے، چاہے انتخابات باقاعدگی سے ہوتے رہیں۔

مجھے ایمرجنسی کا دور یاد آتا ہے، اس وقت بھی بہت سے لوگوں کو یقین تھا کہ ریاست کی طاقت ہر آواز کو خاموش کر سکتی ہے مگر چند ہی برس بعد عوام نے اپنے ووٹ سے تاریخ کا رخ بدل دیا۔ اس واقعے نے ثابت کیا کہ جمہوریت کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ اپنی غلطیوں کی اصلاح خود کر سکتی ہے بشرطیکہ عوام کو بولنے، کہنے اور فیصلہ کرنے کا حق حاصل رہے۔

ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ عوام کی طاقت صرف حکومتیں بدلنے میں نہیں ہوتی۔ اصل طاقت ایک ایسے سماج کی تعمیر میں ہوتی ہے جہاں انصاف ہو، مکالمہ ہو، برداشت ہو اور قانون سب کے لیے برابر ہو، اگر احتجاج نفرت میں بدل جائے، اگر اختلاف تشدد میں تبدیل ہو جائے اور اگر سیاست صرف انتقام کا دوسرا نام بن جائے تو عوامی طاقت بھی اپنا اخلاقی جواز کھو دیتی ہے۔

بقیہ 1

والے اقدامات بدستور گہری تشویش کا باعث ہیں۔ بدھ کو یوم استحصال کے موقع پر اپنے پیغام میں انہوں نے کہا کہ یہ اقدامات جموں کشمیر کے تنازعہ سے متعلق قائم شدہ بین الاقوامی قوانین اور فریم ورک کی خلاف ورزی ہیں اور ان کے نتیجے میں خطے کے عوام کو درپیش مشکلات میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ انہوں نے کہا کہ آج پاکستان کے عوام یوم استحصال منا رہے ہیں تاکہ بھارت کے غیر قانونی طور پر زیر قبضہ جموں و کشمیر کے ثابت قدم عوام کے ساتھ اپنی یکجہتی کا اظہار کرسکیں۔ سینیٹر محمد اسحاق ڈار نے کہا کہ بھارت کے غیر قانونی زیر تسلط جموں و کشمیر کے عوام اپنے جائز حق خودارادیت کے حصول کی جدوجہد میں مسلسل سنگین چیلنجز کا سامنا کررہے ہیں، ہم ان کے بنیادی حقوق کے لیے اپنی غیر متزلزل حمایت کا اعادہ کرتے ہیں، یہ حقوق اقوام متحدہ کے منشور میں درج ہیں اور اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی متعلقہ قراردادوں میں ان کی عکاسی کی گئی ہے۔ نائب وزیراعظم نے کہا کہ 5 اگست 2019 کے اقدامات اور ان کے بعد کیے جانے والے بھارتی اقدامات بدستور گہری تشویش کا باعث ہیں، ان اقدامات نے جنوبی ایشیا میں امن اور استحکام کے فروغ کی کوششوں کو مزید پیچیدہ بنادیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ بین الاقوامی برادری کو چاہیے کہ وہ بین الاقوامی قانون، بین الاقوامی انسانی قانون، انسانی حقوق اور اقوام متحدہ کے فریم ورک کے تحت کیے گئے وعدوں کے احترام کو یقینی بنانے کے لیے اپنا کردار ادا کرے۔ نائب وزیراعظم نے کہا کہ پاکستان مسلسل بھارت سے مطالبہ کرتا آرہا ہے کہ وہ ایسے غیر قانونی اقدامات سے احتراز کرے جو جموں و کشمیر کی بین الاقوامی سطح پر تسلیم شدہ متنازعہ حیثیت کے خلاف ہیں۔ بھارت کو ایسے اقدامات کرنے چاہئیں جو تنازعہ کے پرامن حل کے لیے سازگار ماحول کی تشکیل میں معاون ثابت ہوں۔ انہوں نے کہا کہ ہم ایک بار پھر اس عزم کا اعادہ کرتے ہیں کہ جنوبی ایشیا میں پائیدار امن اور استحکام صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب جموں و کشمیر کے تنازع کو کشمیری عوام کی امنگوں اور اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی متعلقہ قراردادوں کے مطابق حل کیا جائیگا۔ انہوں نے کہا کہ ہم ہر بین الاقوامی فورم پر کشمیری عوام کے حقوق کے لیے اپنی آواز بلند کرتے رہیں گے اور تنازعہ کے منصفانہ اور پرامن تصفیے کے لیے کی جانے والی تمام کوششوں کی حمایت جاری رکھیں گے۔ نائب وزیراعظم نے کہا کہ پاکستان کشمیری عوام کی ثابت قدمی، جرات اور عظیم قربانیوں کو خراج تحسین پیش کرتا ہے، پاکستان ان کے ساتھ غیر متزلزل یکجہتی کا اعادہ کرتا ہے، پاکستان کشمیری عوام اور ان کے جائز حق خودارادیت کے حصول کی منصفانہ جدوجہد کے لیے اپنی غیر متزلزل اخلاقی، سیاسی اور سفارتی حمایت جاری رکھے گا۔ انہوں نے کہا کہ ہم بین الاقوامی برادری، بالخصوص اقوام متحدہ پر زور دیتے ہیں کہ وہ اپنی طویل عرصے سے زیر التوا ذمہ داریوں کو پورا کرے اور جموں و کشمیر کے تنازعہ کے پرامن حل کے لیے بامعنی کوششیں کرے۔

بقیہ 2

جدوجہد کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں، آج بھارت کے 5 اگست 2019 کے غیر قانونی اور یکطرفہ اقدامات کو 7 برس مکمل ہو چکے ہیں۔ صدر نے کہا کہ بھارت نے بین الاقوامی قانون اور سلامتی کونسل کی متعلقہ قراردادوں کی خلاف ورزی کی، بھارت نے جموں و کشمیر کی بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ متنازع حیثیت کو تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے کہا کہ بھارتی اقدامات تنازع کشمیر کی قانونی حیثیت کو تبدیل نہیں کر سکتے، تمام مشکلات کے باوجود مقبوضہ جموں و کشمیر کے عوام مستقبل کے فیصلے، جائز حق کیلئے ثابت قدم ہیں، پاکستان مقبوضہ جموں کشمیر کے عوام کی اخلاقی، سیاسی اور سفارتی حمایت جاری رکھے گا۔

بقیہ 3

نے کہا کہ 5 اگست 2019 کو بھارت کی جانب سے آرٹیکل 370 اور 35 اے کی منسوخی ایک غیر قانونی، یکطرفہ اور بین الاقوامی قوانین کے منافی اقدام تھا، جس کا مقصد کشمیری عوام کی شناخت، حقوق اور تاریخی حیثیت کو متاثر کرنا تھا وزیراعلیٰ نے کہا کہ گزشتہ کئی دہائیوں سے مقبوضہ کشمیر کے عوام ظلم، جبر اور انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیوں کا سامنا کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ کشمیری عوام کو ان کی اپنی سرزمین پر اقلیت میں تبدیل کرنے کی کوششیں نہ صرف قابل مذمت ہیں بلکہ یہ اقوام متحدہ کی قراردادوں اور عالمی قوانین کی بھی صریح خلاف ورزی ہیں میر سرفراز بگٹی نے کہا کہ اہل بلوچستان بھارت کے ان اقدامات کی شدید الفاظ میں مذمت کرتے ہیں اور کشمیری عوام کے حق خودارادیت کی مکمل حمایت کرتے ہیں۔ انہوں نے زور دیا کہ مسئلہ کشمیر کا واحد منصفانہ اور پائیدار حل اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی متعلقہ قراردادوں اور کشمیری عوام کی امنگوں کے مطابق ہی ممکن ہے وزیراعلیٰ بلوچستان نے کہا کہ عالمی برادری کو چاہیے کہ وہ مقبوضہ کشمیر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کا موثر نوٹس لے، کشمیری عوام پر ہونے والے مظالم کو اجاگر کرے اور بھارت پر بین الاقوامی ذمہ داریوں کی پاسداری کے لیے دباؤ بڑھائے انہوں نے کہا کہ حکومت بلوچستان وفاقی حکومت کے ساتھ مکمل یکجہتی کے ساتھ یہ مطالبہ کرتی ہے کہ جس عزم اور مستقل مزاجی سے پاکستان گزشتہ کئی دہائیوں سے کشمیری عوام کی سیاسی، سفارتی اور اخلاقی حمایت کرتا آیا ہے، اسی جذبے کے ساتھ یہ جدوجہد آئندہ بھی جاری رکھی جائے گی۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان اور بلوچستان کے عوام اپنے کشمیری بہن بھائیوں کو کبھی تنہا نہیں چھوڑیں گے اور ان کے حق خودارادیت، آزادی اور انصاف کی جدوجہد کی ہر سطح پر اخلاقی حمایت جاری رکھیں گے وزیراعلیٰ نے کہا کہ یوم استحصال کشمیر اس عزم کی تجدید کا دن ہے کہ پاکستان اور اہل بلوچستان کشمیری عوام کے ساتھ ہر مشکل گھڑی میں کھڑے ہیں اور ان کے جائز حقوق کے حصول تک اپنی بھرپور اخلاقی اور سفارتی حمایت جاری رکھیں گے۔

بقیہ 4

بڑھتی ہوئی پیش رفت کا خیر مقدم کرتے ہوئے سیاسی، دفاعی، اقتصادی، تعلیمی، ثقافتی اور عوامی روابط سمیت مختلف شعبوں میں تعاون کو مزید فروغ دینے کے عزم کا اعادہ کیا۔ دونوں رہنماؤں نے خطے کی تازہ صورتحال، بالخصوص مقبوضہ مغربی کنارے میں بگڑتی ہوئی صورت حال پر تبادلہ خیال کیا۔ نائب وزیراعظم سینیٹر محمد اسحاق ڈار نے مقبوضہ بیت المقدس میں اسلامی اور مسیحی مقدس مقامات کے تحفظ کے لیے اردن کے ثابت قدم کردار اور فلسطینی عوام کی مسلسل حمایت کو سراہا۔ ملاقات میں ایران اور امریکا سے متعلق حالیہ صورتحال سمیت خطے کے مجموعی حالات پر بھی گفتگو ہوئی۔ دونوں رہنماؤں نے کشیدگی میں کمی کے لیے بات چیت اور سفارت کاری کی اہمیت پر زور دیا۔ انہوں نے اقوام متحدہ اور اسلامی تعاون تنظیم (او آئی سی) سمیت دوطرفہ اور کثیرالجہتی فورمز پر قریبی رابطے برقرار رکھتے ہوئے خطے میں امن و استحکام کے فروغ کے لیے مشترکہ کوششیں جاری رکھنے کے عزم کا اظہار کیا۔

بقیہ 5

ہے، اس روز بھارت نے مقبوضہ جموں و کشمیر کی متنازعہ حیثیت تبدیل کرنے کی ناکام کوشش کی۔ انہوں نے کہا کہ بھارت کے 5 اگست 2019 کے اقدامات اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی قراردادوں، بین الاقوامی قوانین اور کشمیری عوام کے حق خودارادیت کی صریح خلاف ورزی ہیں۔ عطا تارڑ نے کہا کہ بھارت مقبوضہ جموں و کشمیر میں جبر، محاصرے اور آبادی کا تناسب تبدیل کرنے کے ہتھکنڈوں کے باوجود کشمیری عوام کے

جذبہ حریت کو شکست نہیں دے سکا۔ انہوں نے کہا کہ کشمیریوں کا حق خودارادیت ہر قیمت پر تسلیم ہونا چاہیے۔ مسئلہ جموں و کشمیر کا واحد پائیدار حل اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی قراردادوں اور کشمیری عوام کی امنگوں کے مطابق استصواب رائے ہے۔ انہوں نے عالمی برادری پر زور دیا کہ وہ مقبوضہ جموں و کشمیر میں انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیوں کا نوٹس لے۔ انہوں نے کہا کہ وزیراعظم محمد شہباز شریف کی قیادت میں حکومت پاکستان مسئلہ کشمیر کو ہر بین الاقوامی فورم پر بھرپور انداز میں اجاگر کررہی ہے۔ مسلم لیگ (ن) کی حکومت کشمیر کاز پر ثابت قدم ہے۔ وفاقی وزیر اطلاعات نے کہا کہ پاکستان کی سیاسی و عسکری قیادت کشمیر کے معاملے پر یکساں موقف رکھتی ہے، بھارت کو حقائق تسلیم کرتے ہوئے کشمیری عوام کی خواہشات کا احترام کرنا ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ مسئلہ کشمیر کا پرامن حل خطے میں امن و استحکام کی ضمانت ہے۔ پاکستان انصاف پر مبنی امن کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھے گا اور حق خودارادیت کے حصول تک کشمیری عوام کے ساتھ کھڑا رہے گا۔

بقیہ 6

دینے اور پاکستان کے ترقیاتی شعبوں میں جائیکا کے تعاون کو وسعت دینے کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی تبادلہ خیال کیا گیا۔ وفاقی وزیر نے جائیکا کے صدر اور وفد کا خیر مقدم کرتے ہوئے پاکستان کے ساتھ جائیکا کی سات دہائیوں پر محیط شراکت داری کو سراہتے ہوئے کہا کہ جاپان کی جانب سے تقریباً 11.7 ارب امریکی ڈالر کی سرکاری ترقیاتی معاونت نے پاکستان میں توانائی، ٹرانسپورٹ انفراسٹرکچر، صنعت، زراعت، آبی وسائل، صحت، تعلیم اور سیکیورٹی سمیت مختلف شعبوں کی ترقی میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ ملاقات کے دوران وفاقی وزیر نے جائیکا کو مین لائن ون (ML-1) ریلوے منصوبے میں شریک مالی معاونت پر غور کرنے کی دعوت دیتے ہوئے کہا کہ ایشیائی ترقیاتی بینک اور دیگر ترقیاتی شراکت دار اس اہم منصوبے کی حمایت کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ایم ایل ون کی جدید خطوط پر تعمیر سے پاکستان کے ٹرانسپورٹ نظام کو مضبوط بنانے، تجارت کے فروغ، صنعتی روابط بہتر بنانے اور پائیدار معاشی ترقی کو تقویت ملے گی۔ اس موقع پر ڈاکٹر تاناکا آکی ہیکو نے منصوبے کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے کہا کہ جائیکا اس تجویز پر مثبت انداز میں غور کرے گی۔ احد چیمہ نے ہنرمند افرادی قوت کی تیاری کو پاکستان کے انسانی وسائل کی ترقی کے لیے ناگزیر قرار دیتے ہوئے کہا کہ جدید تقاضوں سے ہم آہنگ مہارتوں کی فراہمی ملکی اور بین الاقوامی لیبر مارکیٹ کی ضروریات پوری کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔ جائیکا کے صدر نے اس تجویز کی حمایت کرتے ہوئے کہا کہ ادارہ مستقبل کے منصوبوں میں اس شعبے کو شامل کرنے پر غور کرے گا۔ وفاقی وزیر نے ڈیجیٹل معیشت کی بڑھتی ہوئی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے دیہی علاقوں میں انٹرنیٹ انفراسٹرکچر کی بہتری کے لیے جائیکا کے تعاون کی درخواست بھی کی، تاکہ فری لانسرز، کاروباری افراد اور ای کامرس کے شعبے کو مزید فروغ دیا جا سکے۔ ڈاکٹر تاناکا آکی ہیکو نے اس تجویز کو سراہتے ہوئے کہا کہ یہ اقدام جامع معاشی ترقی میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ انہوں نے بڑے ترقیاتی منصوبوں کے لیے معیاری فزیبلٹی اسٹڈیز کی تیاری میں بھی جائیکا سے تعاون کی درخواست کی اور کہا کہ ہر منصوبہ بندی سرمایہ کاری کے حصول اور منصوبوں کی کامیاب تکمیل کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ جائیکا کے صدر نے یقین دہانی کرائی کہ فزیبلٹی اسٹڈیز ادارے کی بنیادی مہارتوں میں شامل ہیں اور اس سلسلے میں حکومت پاکستان کو مکمل تعاون فراہم کیا جائے گا۔ احد چیمہ نے پاکستان کے سیاحتی شعبے، خصوصاً گندھارا تہذیب اور فنون سے متعلق تاریخی مقامات کے تحفظ، بحالی اور ترقی میں تعاون کی ضرورت پر بھی زور دیا۔ انہوں نے کہا کہ اس شعبے میں مشترکہ کوششیں نہ صرف ثقافتی سیاحت کو فروغ دیں گی بلکہ پاکستان اور جاپان کے عوام کے درمیان روابط بھی مزید مضبوط ہوں گے۔ ڈاکٹر تاناکا آکی ہیکو نے اس تجویز کا خیر مقدم کرتے ہوئے اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی یقین دہانی کرائی۔ وفاقی وزیر نے وفد کو پاکستان کی معاشی صورتحال سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ حکومت محتاط معاشی نظم و نسق اور جامع ساختی اصلاحات کے ذریعے طویل المدتی معاشی استحکام اور پائیدار ترقی کے حصول کے لیے پرعزم ہے۔ انہوں نے کہا کہ آئی ایم ایف کے اسٹینڈ بائی ارینجمنٹ کی کامیاب تکمیل کے بعد ایکسٹینڈڈ فنڈ فیسلٹی اور ریزیلینس اینڈ سسٹین ایبلٹی فیسلٹی کے تحت پاکستان کی پیش رفت اطمینان بخش رہی ہے اور ملک نے تمام مقداری کارکردگی اہداف کامیابی سے حاصل کیے ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ مسلسل اصلاحات اور بہتر ہوتے ہوئے معاشی اشاریوں کی بدولت پاکستان کی معیشت استحکام اور مضبوطی کی راہ پر گامزن ہے۔ جائیکا کے صدر نے حکومت کی معاشی اصلاحات اور اقتصادی بنیادوں کو مستحکم بنانے کی کوششوں کو سراہا۔ ملاقات میں دونوں جانب سے پاکستان اور جاپان کے درمیان ترقیاتی شراکت داری کو مزید مضبوط بنانے کے عزم کا اعادہ کیا گیا اور اس بات پر اتفاق کیا گیا کہ انفراسٹرکچر، انسانی وسائل کی ترقی، ڈیجیٹل تبدیلی، سیاحت اور دیگر باہمی دلچسپی کے شعبوں میں نئے مواقع تلاش کرنے کے لیے قریبی تعاون جاری رکھا جائے گا، تاکہ پاکستان میں پائیدار اور جامع معاشی ترقی کو فروغ دیا جا سکے۔ پاکستان اور جاپان کے درمیان دیرینہ ترقیاتی شراکت داری کو مزید وسعت دینے کے لیے دونوں ممالک انفراسٹرکچر، ریلوے، ہنرمند افرادی قوت، ڈیجیٹل معیشت، سیاحت اور دیگر اہم شعبوں میں تعاون بڑھانے پر متفق ہیں۔ جائیکا نے گزشتہ 7 دہائیوں کے دوران پاکستان کی سماجی و اقتصادی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے اور حکومت مستقبل میں بھی اس موثر شراکت داری کو مزید مضبوط بنانے کی خواہاں ہے۔

بقیہ 7

چینٹ جہازوں کو پورٹ ہینڈلنگ چارجز میں 80 فیصد تک رعایت دی جائے گی، جبکہ کراچی پورٹ پر واریج میں 20 سے 80 فیصد تک رعایت حاصل ہوگی۔ انہوں نے بتایا کہ کراچی پورٹ پر 14 روز جبکہ ٹی پی ایس ایریا میں 30 روز تک مفت اسٹوریج کی سہولت فراہم کی جائے گی۔ جنید انوار چوہدری کے مطابق پورٹ قاسم پر وارج میں 100 فیصد رعایت دی جائے گی، جبکہ پورٹ قاسم کے زمینی پر 7 روز تک مفت اسٹوریج کی سہولت ہوگی، جس میں مزید 21 روز تک توسیع بھی ممکن ہو گی۔ وفاقی وزیر بحری امور نے مزید بتایا کہ کنٹینر ٹرمینلز نے ٹرمینل ہینڈلنگ چارجز میں 25 فیصد تک کمی کر دی ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ ٹرانس شپمنٹ کے حوالے سے تمام پرانے ایس آر اوز اور نوٹی فکیشن ختم کردیے گئے ہیں۔

بقیہ 8

خودارادیت کی صریحاً خلاف ورزی تھا، پاکستان ہر سفارتی، سیاسی اور بین الاقوامی فورم پر کشمیری عوام کی آواز بلند کرتا رہے گا۔ بدھ کو یوم استحصال کشمیر کے موقع پر جاری بیان میں وزیر مملکت نے کہا کہ مقبوضہ جموں و کشمیر کی خصوصی آئینی حیثیت کا خاتمہ، آبادی کا تناسب تبدیل کرنے کی کوششیں اور بنیادی انسانی حقوق کی مسلسل خلاف ورزیاں نہ صرف بین الاقوامی قوانین کی نفی ہے بلکہ خطے کے امن و استحکام کے لیے بھی سنگین خطرہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ طاقت اور جبر کے ذریعے کسی قوم کی شناخت، تاریخ، ثقافت اور آزادی کی امنگ کو دبایا نہیں جاسکتا۔ وجیہہ قمر نے کشمیری عوام کی قربانیوں، استقامت اور عزم کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کئی دہائیوں سے کشمیری عوام کی منصفانہ جدوجہد کی سیاسی، سفارتی اور اخلاقی

حمایت کرتا آیا ہے اور یہ آئندہ بھی پوری قوت کے ساتھ جاری رہے گی۔ انہوں نے کہا کہ نوجوان نسل کو مسئلہ کشمیر کے تاریخی، قانونی اور انسانی پہلوؤں سے آگاہ کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے، تعلیمی اداروں کی ذمہ داری ہے کہ وہ نوجوانوں میں تحقیق، تنقیدی سوچ، انسانی حقوق کے احترام اور عالمی ذمہ داری کے شعور کو فروغ دیں تاکہ وہ حق، انصاف اور امن کے فروغ میں مثبت کردار ادا کر سکیں۔ وزیر مملکت نے عالمی برادری بالخصوص اقوام متحدہ اور انسانی حقوق کے عالمی اداروں سے مطالبہ کیا کہ وہ مقبوضہ جموں و کشمیر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں، شہری آزادیوں پر عائد پابندیوں اور آبادی کا تناسب تبدیل کرنے کی کوششوں کا موثر نوٹس لیں اور اقوام متحدہ کی متعلقہ قراردادوں کے مطابق کشمیری عوام کو ان کا تسلیم شدہ حق خودارادیت دلانے کے لیے عملی اقدامات کریں۔ انہوں نے کہا کہ مسئلہ کشمیر کا اقوام متحدہ کی قراردادوں اور کشمیری عوام کی امنگوں کے مطابق منصفانہ اور پائیدار حل ہی جنوبی ایشیا میں دیرپا امن، سلامتی اور استحکام کی ضمانت ہے۔ وزیر مملکت نے اس عزم کا بھی اعادہ کیا کہ پاکستان ہر سفارتی، سیاسی اور بین الاقوامی فورم پر کشمیری عوام کی آواز بلند کرتا رہے گا اور ان کی جائز جدوجہد کی بھرپور حمایت جاری رکھے گا۔

بقیہ 9

سٹر کے مرتب کردہ تجارتی اعداد و شمار سے معلوم ہوا ہے کہ جنوری سے جون 2026 تک پاکستان نے 1.0 سے 1.5 لیٹر انجن کی حامل پلگ ان ہائبرڈ الیکٹرک وہیکل گاڑیاں 191 ملین ڈالر مالیت کی درآمد کیں، جو گزشتہ سال کی اسی مدت میں 16.3 ملین ڈالر تھیں۔ اس طرح ان کی مالیت میں 1073 فیصد اضافہ ہوا، جبکہ درآمد شدہ گاڑیوں کی تعداد میں بھی نمایاں اضافہ ریکارڈ کیا گیا۔ اسی طرح پلگ ان ہائبرڈ سیڈان گاڑیوں کی درآمدات بھی 9.2 ملین ڈالر سے بڑھ کر 90.3 ملین ڈالر تک پہنچ گئیں، جبکہ یونٹس کی تعداد تقریباً دس گنا بڑھ گئی۔ ڈائنامک انجینئرنگ اینڈ آٹومیشن گروپ کے بانی اور چیف ایگزیکٹو اویس میر نے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ پلگ ان ہائبرڈ فور وہیل ڈرائیو کراس اوور گاڑیوں، جو ایک سال قبل پاکستانی مارکیٹ میں تقریباً موجود نہیں تھیں، نے 2026 کی پہلی ششماہی میں ہی 123 ملین ڈالر کی درآمدات ریکارڈ کیں۔ رپورٹ کے مطابق الیکٹرک گاڑیوں کا رجحان صرف کاروں تک محدود نہیں رہا بلکہ چینی الیکٹرک موٹر سائیکلوں کی درآمدات میں بھی نمایاں اضافہ ہوا۔ ان کی مالیت 14.7 ملین ڈالر سے بڑھ کر 69.9 ملین ڈالر تک پہنچ گئی، جو پاکستان کے شہری علاقوں میں الیکٹرک دو پہیہ گاڑیوں کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو ظاہر کرتی ہے۔ اویس میر کے مطابق 2026 کی پہلی ششماہی میں نئی توانائی سے چلنے والی گاڑیوں کے تمام بڑے شعبوں جن میں پلگ ان ہائبرڈ ویگن، سیڈان اور فور وہیل ڈرائیو کراس اوور شامل ہیں، میں تین سے چار ہندسوں تک کی شرح سے ترقی ہوئی۔ رپورٹ کے مطابق ماہرین کا کہنا ہے کہ الیکٹرک گاڑیوں کی بڑھتی ہوئی طلب کی بڑی وجوہات میں پاکستان میں آٹو فنانسنگ کے مسائل کے بعد صارفین کی جمع شدہ طلب، چینی ساختہ ہائبرڈ اور الیکٹرک گاڑیوں کی کم قیمتیں اور جدید ٹیکنالوجی تک آسان رسائی شامل ہیں۔ نیکسٹ برج کے چیئرمین اور چیف ایگزیکٹو عمر ملک نے کہا کہ پاکستان کی آٹو انڈسٹری میں تاریخی تبدیلی کا مرکز 2030 تک ملک کی 30 فیصد گاڑیوں کو برقی توانائی پر منتقل کرنے کا ہدف ہے۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان کی الیکٹرک گاڑیوں کی پالیسی میں چین کی سپلائی چین اہم کردار ادا کر رہی ہے، جو مسابقتی قیمتوں کے ذریعے مقامی صنعت کو مضبوط بنانے میں مددگار رہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ بڑھتی ہوئی ایندھن کی قیمتیں الیکٹرک نقل و حرکت کو سستی ٹرانسپورٹ کا مستقبل بنا رہی ہیں جبکہ خاموش اور آسانی سے چلنے والی الیکٹرک موٹر سائیکلیں پاکستانی خواتین کے لیے محفوظ اور خودمختار سفر کا ذریعہ بن رہی ہیں، یہ رجحان صاف توانائی، ماحولیاتی تحفظ اور صنفی مساوات کے عالمی اہداف کے حصول میں بھی معاون ثابت ہو رہا ہے۔

بقیہ 10

یکجہتی کا اظہار کیا ہے۔ مسلح افواج نے بھارت کے زیر قبضہ جموں و کشمیر کے عوام کے ساتھ اپنی غیر متزلزل یکجہتی کو دہرایا اور کشمیریوں کی ناقابل تنسیخ حق خودارادیت کے حصول کی جائز جدوجہد کے لیے غیر متزلزل حمایت کا عزم ظاہر کیا۔ آئی ایس پی آر کی جانب سے جاری بیان میں کہا گیا کہ مقبوضہ جموں و کشمیر پر بھارتی سیکیورٹی فورسز کا مسلسل غیر قانونی قبضہ، بھارتی فوجی محاصرہ، انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیاں اور آبادی کا تناسب تبدیل کرنے کی کوششیں شدید تشویش کا باعث ہیں۔ آئی ایس پی آر کے مطابق بھارت کے اشتعال انگیز بیانات اور جارحانہ طرز عمل خطے میں عدم استحکام کو مزید بڑھانے کی وجہ بن رہے ہیں، جنوبی ایشیا میں پائیدار امن اور استحکام کا انحصار مسئلہ جموں و کشمیر کے منصفانہ اور پرامن حل پر ہے۔ آئی ایس پی آر کا کہنا ہے کہ یہ حل کشمیری عوام کی امنگوں اور اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی متعلقہ قراردادوں کے مطابق ہونا چاہیے۔ ترجمان پاک فوج کے مطابق پاکستانی عوام، مسلح افواج بھارتی غیر قانونی زیر قبضہ جموں و کشمیر کے شہداء کو بھرپور خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ آئی ایس پی آر کے مطابق کشمیریوں کی آزادی کی جائز اور برحق جدوجہد میں شانہ بشانہ کھڑے رہنے کے غیر متزلزل عزم کو دہراتے ہیں۔

بقیہ 11

خوراک سندھ کا کہنا ہے کہ سندھ حکومت پاسکو سے گندم خرید کر سندھ کا ٹارگٹ پورا کرنے جا رہی ہے۔ مخدوم محبوب الزمان نے کہا ہے کہ کراچی میں آٹے کا ریٹ 130 اور 140 روپے ہے۔

بقیہ 12

اقدامات کو سات برس مکمل ہو چکے ہیں، تاہم ان اقدامات سے نہ تنازعہ کشمیر کی حیثیت تبدیل ہوئی اور نہ ہی کشمیری عوام کے عزم میں کوئی کمی آئی۔ حافظ نعیم الرحمٰن نے کہا کہ مودی حکومت کا یہ اقدام اقوام متحدہ کی قراردادوں، بین الاقوامی قوانین اور عالمی اصولوں کی صریح خلاف ورزی تھا، جو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہونے کے بھارتی دعوے پر بھی سوالیہ نشان ہے۔ انہوں نے کہا کہ کشمیر کی خصوصی حیثیت کا خاتمہ عالمی برادری اور سلامتی کونسل کے لیے بھی ایک کھلا چیلنج ہے، بھارت گزشتہ 78 برس سے مقبوضہ کشمیر میں ظلم و ستم اور قتل و غارت کی پالیسی پر عمل پیرا ہے، مگر کشمیری عوام کی آزادی کی خواہش کو دبایا نہیں جا سکا۔ حافظ نعیم الرحمٰن نے کہا کہ پاکستانی عوام نے ہمیشہ کشمیری عوام کے ساتھ اپنی دلی وابستگی اور یکجہتی کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے کہا کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے اور پاکستانیوں کے دل اپنے کشمیری بھائیوں کے ساتھ دھڑکتے ہیں۔ انہوں نے اس امید کا اظہار کیا کہ وہ دن دور نہیں جب کشمیری عوام کی طویل جدوجہد کامیاب ہوگی۔

بقیہ 13

منصوبوں کا جائزہ لیا گیا۔ دوران ملاقات فیصل آباد میں واٹر سپلائی منصوبوں پر پیش رفت کا بھی جائزہ لیا گیا، جبکہ تعلیم، صحت، غذائیت، خواتین کو بااختیار بنانے اور انسانی وسائل کی ترقی کے شعبوں میں بھی تعاون کو مزید بڑھانے پر اتفاق کیا گیا۔ وزیراعلیٰ مریم نواز شریف نے جائیکا کے تعاون سے فیصل آباد کی طرز پر واٹر سپلائی، سینی ٹیشن اور اربن انفراسٹرکچر ماڈل کو پنجاب کے دیگر شہروں تک توسیع دینے میں دلچسپی کا اظہار کیا۔ انہوں نے زچہ و بچہ کی صحت، صاف پانی کی فراہمی، معیاری تعلیم، صنفی مساوات اور خواتین کو بااختیار بنانے کے لیے جائیکا کے کردار کو سراہتے ہوئے کہا کہ پنجاب حکومت اس شراکت داری کو مزید وسعت دینا